رجسٹر ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۲ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

صفحه خالی

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۴	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۹ء	جلد ۵۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

کئی سال سے مسلسل یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہر بقر عید کے موقع پر اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ سے بھی اور اشتہاروں اور پمفلٹوں کی صورت میں بھی قربانی کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھایا جاتا ہے اور ہزاروں بندگان خدا کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا جاتا ہے کہ یہ کوئی دینی حکم نہیں ہے بلکہ ایک غلط اور نقصان دہ رسم ہے جو ملاؤں نے ایجاد کرلی ہے۔ اس وسوسہ اندازی کے خلاف قریب قریب ہر سال ہی علماء کی طرف سے مسئلے کی پوری وضاحت کردی جاتی ہے، قربانی کے ایک حکم شرعی ہونے اور مسنون اور واجب ہونے کے دلائل دیئے جاتے ہیں، اور مخالفین کے استدلال کی کمزوریاں کھول کر رکھ دی جاتی ہیں۔ لیکن ہر مرتبہ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد دوسرے سال پھر دیکھا جاتا ہے کہ وہی لگی بندھی باتیں اسی طرح دہرائی جا رہی ہیں، گویا نہ کسی نے قربانی کے مشروع ہونے کا کوئی ثبوت دیا اور نہ اس کے خلاف دلیلوں کی کوئی کمزوری واضح کی۔

معمول کے مطابق یہی ڈراما پچھلی بقر عید کے موقع پر بھی دیکھا گیا۔ بلکہ اس مرتبہ تو ایک قدم اور آگے بڑھا کر حکومت کو بے تکلف یہ مشورہ دے دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کو از روئے قانون محدود کرنے کی کوشش کرے۔

ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جو ابھی چند سال پہلے تک متحدہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ ہماری سرحد کے اُس پار ہمارے کروڑوں دینی بھائی اب بھی سابق متحدہ ہندوستان کے اُس حصے میں موجود ہیں جس سے ہم الگ ہوئے تھے۔ ان کو آج بھی اُسی قوم سے سابقہ

در پیش ہے جس سے کبھی ہم کو درپیش تھا، بلکہ وہ آج تقسیم سے قبل کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ کمزوری اور مغلوبی کی حالت میں مبتلا ہیں۔ اُن پر جس قوم کو غلبہ حاصل ہے وہ سالہا سال سے گائے کی قربانی پر ہمارے ساتھ سر پھٹول کرتی رہی تھی، اور تقسیم کے بعد جب اسے مسلمانوں پر پورا قابو حاصل ہوا تو اس نے سب سے پہلے ان کو اسی حق سے محروم کیا۔ اب یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ پاکستان جو ہندو تہذیب و تمدن کے تسلط سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو بچانے کے لیے بنا تھا، وہی آگے بڑھ کر ہندوستان کے ہندوؤں کو یہ رہنمائی دے کہ مہاراج گائے کی قربانی کیسی، آپ تو ہر قسم کی قربانی از روئے قانون بند کر سکتے ہیں۔ یہ چیز سرے سے شعائر اسلام میں داخل ہی نہیں ہے کہ اسے روک دینے پر آپ کو کسی مذہبی تعصب کا الزام دیا جا سکے۔ حق بجانب وہ مسلمان نہیں ہے جو اسے اپنا مذہبی حق کہہ کر اس پر اصرار کرتا ہے، بلکہ وہ ہندو ہے جو اِس غیر مذہبی رسم سے اس کو باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں تو پاکستان میں اس جاہل مسلم اکثریت سے سابقہ ہے، اس لیے یہاں ہم بربنائے احتیاط بتدریج اسے محدود کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ آپ کو تو کسی کا ڈر نہیں ہے۔ آپ بیک قلم اسے مسدود فرما دیں۔ اس معاملے میں شریعتِ اسلام مسلمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ آپ کے ساتھ ہو گی!

کس قدر جلدی بھولے ہیں ہم اس حالت کو جس سے خدا نے ہمیں نکالا اور جس میں ہمارے کروڑوں بھائی اب بھی مبتلا ہیں۔ شاید برطانوی ہند میں ہندوؤں سے ہماری کشمکش صرف اس لیے تھی کہ اپنی تہذیب کا جھٹکا دوسروں سے کرانے کے بجائے ہم خود اسے حلال کرنا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں اختلافات کی پہلے ہی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ تفرقوں کی ماری ہوئی قوم فی الواقع رحم کی مستحق تھی۔ کسی کے دل میں اس کے لیے خیر خواہی کا جذبہ موجود ہوتا تو وہ یہ سوچتا کہ اس کے اختلافات میں اتفاق کی کوئی راہ دریافت کرے۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ جو لوگ خیر خواہی کے ارادے یا دعوے سے اُٹھتے ہیں وہ ان چیزوں میں بھی اختلاف کی راہیں نکال رہے ہیں جن میں خوش قسمتی سے

مسلمانوں کے درمیان ابتدا سے آج تک اتفاق موجود ہے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک دین کی اصل خدمت اور ملت کی صحیح خیر خواہی یہ ہے کہ متفق علیہ مسائل کو بھی کسی نہ کسی طرح اختلافی بنا دیا جائے اور کوئی چیز ایسی نہ چھوڑی جائے جس کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ سب مسلمان اس میں متفق ہیں۔

قربانی کا مسئلہ ایسے ہی متفق علیہ مسائل میں سے ہے۔ پہلی صدی ہجری کے آغاز سے آج تک مسلمان اس پر متفق رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ کی پوری پونے چودہ صدیوں میں آج تک اس کے مشروع اور مسنون ہونے کے بارے میں اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ اس میں ائمۂ اربعہ اور اہل حدیث متفق ہیں۔ اس میں شیعہ اور سنی متفق ہیں۔ اس میں قدیم زمانے کے مجتہدین بھی متفق تھے اور آج کے سب فرقے بھی متفق ہیں۔ اب یہ تفرقہ و اختلاف کا شیطانی ذوق نہیں تو اور کیا ہے کہ کوئی شخص ایک نرالی بات لیکر اٹھے اور اس متفق علیہ اسلامی طریقے کے متعلق بیچارے عام مسلمانوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرے کہ یہ تو سرے سے کوئی اسلامی طریقہ ہی نہیں ہے۔

پھر یہ اختلاف بھی کسی معمولی بنیاد پر نہیں بلکہ ایک بہت بڑی فتنہ انگیز بنیاد پر اٹھایا گیا ہے یعنی سوال یہ چھیڑا گیا ہے کہ یہ بقر عید کی قربانی آخر تم کس سند (AUTHORITY) پر کرتے ہو، قرآن میں تو اس کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ اسلام میں سند صرف ایک قرآن ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کوئی سند نہیں ہے۔ حالانکہ جس خدا نے قرآن نازل کیا ہے، اسی نے اپنا رسول بھی مبعوث کیا تھا۔ اس کا رسول اسی طرح ایک اتھارٹی ہے جس طرح اس کی کتاب۔ اس کے رسول کی اتھارٹی کسی طرح بھی اس کی کتاب کی اتھارٹی سے کم نہیں ہے، نہ وہ کتاب کے ساتھ کوئی ضمنی حیثیت رکھتی ہے، نہ اس کے ذریعے سے دیئے ہوئے کسی حکم کے لیے قرآن کی توثیق کسی درجے میں بھی ضروری ہے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ قرآن جس کی سند پر کلام اللہ مانا گیا ہے وہ بھی رسول ہی کی سند ہے۔ اگر رسول نے یہ نہ بتایا ہوتا کہ یہ قرآن خدا نے اس پر نازل کیا ہے تو ہمارے پاس نہ یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا اور نہ یہ ماننے کی کوئی وجہ تھی کہ یہ کتاب خدا کی کتاب ہے۔

اب یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ جو حکم رسول نے دیا ہو اور جس طریقے پر رسول نے خود عمل کیا اور اہلِ ایمان کو اس پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہو، اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ اس کا حکم قرآن میں ہو تو ہم مانیں گے ورنہ پیروی سے انکار کر دیں گے؟ اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ خدا کی کتاب تو واجب الاتباع ہے مگر خدا کا رسول واجب الاتباع نہیں ہے!

یہ بات حقیقت کے خلاف بھی ہے اور سخت فتنہ انگیز بھی۔

حقیقت کے خلاف یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذاللہ محض ایک ڈاکیہ بنا کر نہیں بھیجا تھا کہ آپ کا کام اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچا دینے کے بعد ختم ہو جائے اور اس کے بعد بندے اللہ میاں کے نامۂ گرامی کو لے کر جس طرح ان کی سمجھ میں آئے اس کی تعمیل کرتے رہیں۔ خود قرآن کی رو سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی نوعیت کفار کے لیے الگ اور اہلِ ایمان کے لیے الگ ہے۔ کفار کے لیے آپ بے شک صرف مبلغ اور داعی الی اللہ ہیں۔ مگر جو لوگ ایمان لے آئیں ان کے لیے تو آپ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے مکمل نمائندے ہیں۔ آپ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ آپ کے اتباع کے سوا اللہ کی خوشنودی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اللہ نے آپ کو اپنی طرف سے معلّم، مربّی، رہنما، قاضی، آمر و ناہی اور حاکمِ مطاع، سب کچھ بنا کر مامور فرمایا تھا۔ آپ کا کام یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے عقیدہ و فکر، مذہب و اخلاق، تمدن و تہذیب، معیشت و سیاست، غرض زندگی کے ہر گوشے کے لیے وہ اصول، طریقے اور ضابطے مقرر کریں جو اللہ کی پسند کے مطابق ہوں۔ اور مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ جو کچھ آپ نے سکھایا اور مقرر کیا ہے اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ رسول اللہ جو حکم دیں اس پر ان سے سند طلب کرے۔ رسول کی ذات خود سند ہے۔ اس کا حکم بجائے خود قانون ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی

مسلمان یہ سوال کرنے کا مجاز نہیں ہے کہ جو حکم رسول نے دیا ہے اس کا حوالہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کوئی ہدایت خواہ اپنی کتاب کے ذریعہ سے دے یا اپنے رسول کے ذریعہ سے، سند اور وزن کے اعتبار سے دونوں بالکل یکساں ہیں اور قانونِ الٰہی ہونے میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

بالکل غلط کہتا ہے جو کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور فیصلوں اور ہدایات کی قانونی حیثیت صرف اپنے عہد کے رئیس مملکت (HEAD OF THE STATE) ہونے کی بنا پر تھی یعنی جب آپ رئیس مملکت تھے اس وقت آپ کی اطاعت واجب تھی اور اب جو رئیسِ مملکت یا مرکزِ ملت ہو گا اس کی اطاعت اب واجب ہو گی۔ یہ رسالت کا بدترین تصور ہے جو کسی شخص کے ذہن میں آسکتا ہے۔ اسلامی تصورِ رسالت سے اس کو دور کا واسطہ بھی نہیں۔ رئیسِ مملکت کے منصب کو آخر رسول کے منصب سے کیا نسبت ہے۔ اس کو عام مسلمان منتخب کرتے اور وہی معزول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ حالانکہ رسول کو خدا مقرر کرتا ہے اور خدا کے سوا کسی کو اسے معزول کرنے کا اختیار نہیں۔ رئیسِ مملکت جس علاقے کا رئیس ہو اور جب تک اس منصب پر رہے صرف اسی علاقے میں اسی وقت تک اس کو رئیس ماننا واجب ہے اور پھر بھی اس پر ایمان لانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اسے نہ مانے تو ملتِ اسلام سے خارج ہو جائے۔ حالانکہ رسول جس آن مبعوث ہوا اس وقت سے قیامت تک دنیا میں کوئی شخص اس پر ایمان لائے بغیر ملتِ اسلامیہ کا فرد نہیں بن سکتا۔ رئیسِ مملکت کو آپ دل میں بُرا جان سکتے ہیں، اس کو برملا بُرا کہہ سکتے ہیں، اس کے قول و فعل کو علانیہ غلط کہہ سکتے ہیں، اور اس کے فیصلوں سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن رسول کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کرنا تو درکنار، اس کا خیال بھی اگر دل میں آجائے تو ایمان سلب ہو جائے۔ رئیسِ مملکت کے حکم کو ماننے سے آپ صاف انکار کر سکتے ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ بس ایک جرم ہو گا۔ مگر رسولؐ کے حکم کو اگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ رسولؐ

کا حکم ہے۔ آپ ماننے سے انکار کر دیں تو قطعی خارج از اسلام ہو جائیں۔ اس کے حکم پر تو آپ چون وچرا تک نہیں کر سکتے، بلکہ اس کے خلاف دل میں کوئی تنگی تک محسوس کرنا ایمان کے منافی ہے۔ رئیس مملکت عوام کا نمائندہ ہے اور رسول خدا کا نمائندہ۔ رئیسِ مملکت کی زبان قانون نہیں ہے، بلکہ الٹا قانون اس کی زبان پر حاکم ہے۔ مگر رسولِ خدا کی زبان قانون ہے، کیونکہ خدا اسی زبان سے اپنا قانون بیان کرتا ہے۔ اب یہ کیسا سخت طغیانِ جاہلیت ہے کہ رسول کو محض ایک علاقے اور زمانے کے رئیسِ مملکت کی حیثیت دے کر کہا جائے کہ اس کے دیئے ہوئے احکام اور ہدایات بس اسی زمانے اور علاقے کے لوگوں کے لیے واجب الاتباع تھے، آج ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔

یہ تو ہے حقیقت کے خلاف اس تصور کی بغاوت۔ اب ذرا اس کی فتنہ انگیزی کا اندازہ کیجیے۔ آج جس چیز کو آپ اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی تہذیب و تمدن کہتے ہیں، جس کے اصول اور عملی مظاہر کی یکسانی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک ملت بنا رکھا ہے، جس کی یک رنگی نے مسلم کو مسلم سے جوڑا اور کافر سے توڑا ہے، جس کی امتیازی خصوصیات نے مسلمانوں کو ساری دنیا میں غیر مسلموں سے ممیز کیا اور سب سے الگ ایک مستقل امت بنایا ہے، اس کا تجزیہ کر کے آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا کم از کم $\frac{9}{10}$ حصہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقتدارِ رسالت سے مسلمانوں میں رائج کیا ہے اور مشکل $\frac{1}{10}$ حصہ ایسا ہے جس کی سند قرآن میں ملتی ہے۔ پھر اس $\frac{1}{10}$ کا حال بھی یہ ہے کہ اگر اس پر عملدرآمد کی وہ صورت شریعت واجب الاتباع نہ ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہے تو دنیا میں مختلف مسلمان ـــ افراد بھی اور گروہ بھی اور ریاستیں بھی ـــ اس پر عملدرآمد کی اتنی مختلف شکلیں تجویز کر لیں کہ ان کے درمیان کوئی وحدت و یکسانی باقی نہ رہے۔ اب خود اندازہ کر لیجیے کہ اگر وہ سب کچھ ساقط کر دیا جائے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رواج دینے سے مسلمانوں میں رائج ہے، تو اسلام میں باقی کیا رہ جائے گا جسے ہم اسلامی تہذیب و تمدن کہہ سکیں اور جس پر دنیا بھر کے مسلمان مجتمع رہ سکیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے۔ یہ اذان جو دنیا بھر میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ نمایاں ملی شعار ہے، جسے روئے زمین کے ہر گوشے میں ہر روز پانچ وقت مسلم اور کافر سب سنتے ہیں، اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے مقرر اور رائج کیا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی حکم نہیں۔ نہ وہ اس کے الفاظ بتاتا ہے نہ یہ حکم دیتا ہے کہ روزانہ پانچ وقت نمازوں سے پہلے یہ پکار بلند کی جائے۔ اس میں ایک جگہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ "جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے روز تو دوڑو اللہ کی یاد کی طرف" ظاہر ہے کہ یہ پکار سن کر دوڑنے کا حکم ہے، خود اس پکار کا حکم نہیں ہے۔ دوسری جگہ اہلِ کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّ لَعِبًا "جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں"۔ یہ سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے بلکہ صرف ایک رائج شدہ چیز کا مذاق اڑانے پر اہلِ کتاب کی مذمت کی جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ اختیارِ اقتدار جس نے اس اذان کے الفاظ مقرر کیے اور اسے مسلمانوں میں رواج دیا، دائمی اور عالمگیر تشریع مقرر کرنے کا مجاز نہ ہوتا تو کیا صرف ان دو آیتوں کی بنیاد پر آج دنیا میں آپ اذان کی آواز کہیں سن سکتے تھے؟

خود یہ نماز باجماعت جس کے لیے اذان دی جاتی ہے، اور یہ نمازِ جمعہ جس کی پکار سن کر دوڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ عیدین کی نمازیں جو ہزارہا مسلمانوں کو اکٹھا کرتی ہیں، اور یہ مسجدیں جو دنیا بھر میں مسلم معاشرے کی اجتماعی زندگی کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتی ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہو۔ قرآن صرف نماز کا حکم دیتا ہے۔ باقاعدہ نماز باجماعت ادا کرنے کا کوئی صاف حکم نہیں دیتا۔ جمعہ کی نماز کے لیے وہ صرف یہ کہتا ہے کہ جب اس کے لیے پکارا جائے تو دوڑ پڑو۔ اسے خود نمازِ جمعہ قائم کرنے کا حکم مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔ عیدین کی نمازوں کا تو سرے سے اس میں کوئی ذکر ہی نہیں۔ رہیں مسجدیں تو ان کے

احترام کا حکم ضرور قرآن میں دیا گیا ہے مگر یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اے مسلمانو تم اپنی ہر بستی میں مسجد تعمیر کرو، اور اس میں ہمیشہ نماز با جماعت قائم کرنے کا اہتمام کرو۔ یہ ساری چیزیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس اختیار و اقتدار کی بنا پر، جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو شارع مقرر کیا تھا، مسلمانوں میں رائج کی ہیں۔ اگر یہ اختیار و اقتدار مسلّم نہ ہوتا تو اسلام کے یہ نمایاں ترین شعائر، جن کا مسلمانوں کو مجتمع کرنے اور ایک یک رنگ امت بنانے اور اسلامی تہذیب کی صورت گری کرنے میں سب سے زیادہ حصّہ ہے، کبھی قائم نہ ہونے اور مسلمان آج مسیحیوں سے بھی زیادہ منتشر و پراگندہ ہوتے۔

یہ صرف سامنے کی چند مثالیں ہیں۔ ورنہ تفصیل کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف ایک کتاب ہی ملی ہوتی اور اس کے ساتھ اللہ کے رسولؐ نے آکر انفرادی زندگی سے لیکر خاندان، معاشرے اور ریاست تک کے معاملات میں ہمارے لیے تہذیب کی ایک متعین صورت نہ بنا دی ہوتی تو آج ہم ایک ممتاز عالمگیر ملّت واحدہ کی حیثیت سے موجود نہ ہوتے۔ اب جو شخص اس رسالت کی شرعی حیثیت اور اس کی قانونی سند کو چیلنج کرتا ہے اس کے اس چیلنج کی زد ایک قربانی کے مسئلے یا دو چار منفرد مسئلوں پر نہیں پڑتی، بلکہ اسلامی تہذیب کے پورے نظام اور ملّتِ اسلامیہ کی اساس و بنیاد پر پڑتی ہے۔ جب تک ہم بالکل خودکشی پر آمادہ نہ ہو جائیں ہمارے لیے کسی کی یہ بات ماننا محال ہے کہ جس چیز کی سند قرآن میں ملے بس وہی باقی رہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند پر جتنی چیزوں کا مدار ہے وہ سب ساقط کر دی جائیں۔

اعتراض کی اس غلط بنیاد اور اس کے خطرناک نتائج کو سمجھ لینے کے بعد اب بجائے خود اس مسئلے کو دیکھیے جس پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ قربانی کے متعلق یہ کہنا کہ قرآن میں سرے سے اس کا کوئی حکم ہی نہیں ہے، خلافِ واقعہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن وہ اصولی حقائق بیان کرتا ہے جن کی بنا پر انسان کو اللہ تعالیٰ کے لیے جانوروں کی قربانی کرنی چاہیے، اور پھر اس کا

ایک عام حکم دے کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس حکم پر عمل درآمد کیسے کیا جائے، اس کی کوئی تصریح وہ نہیں کرتا۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ آپ اسی خدا کی ہدایت کے تحت جس نے قرآن آپ پر نازل کیا تھا، اس کی عملی صورت، اس کا وقت، اس کی جگہ اور اس کے ادا کرنے کا صحیح طریقہ مسلمانوں کو بتائیں اور خود اس پر عمل کر کے دکھائیں۔ یہ کام تنہا ایک قربانی کے متعلق ہی نہیں، قرآن کے دوسرے احکام کے متعلق بھی حضور نے کیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، وراثت، غرض مسلم معاشرے کے مذہب اور تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست اور قانون و عدالت اور صلح و جنگ کے تمام معاملات میں یہی کچھ ہوا ہے کہ قرآن نے کسی کے بارے میں مختصر اور کسی کے بارے میں کچھ تفصیل کے ساتھ احکام دیئے، یا صرف اشارۃً اللہ تعالیٰ کی مرضی بیان کر دی، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی جامہ پہنانے کی صورتیں واضح حدود کے ساتھ متعین فرمائیں، ان پر خود کام کر کے دکھایا، اور اپنی رہنمائی میں ان کو رائج کیا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس میں شک نہیں کر سکتا کہ کتابی رہنمائی کے ساتھ یہ عملی رہنمائی بھی انسانوں کو درکار تھی، اور اس رہنمائی کے لیے اللہ کے رسول کے سوا کوئی دوسرا نہ موزوں ہو سکتا تھا نہ مجاز۔

قرآن میں اس مسئلے کے متعلق جو اصولی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) عبادت کی تمام وہ صورتیں جو انسان نے غیر اللہ کے لیے اختیار کی ہیں، دینِ حق میں وہ سب غیر اللہ کے لیے حرام اور خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لیے واجب کر دی گئیں۔ مثلاً انسان غیر اللہ کے آگے جھکتا اور سجدے کرتا تھا۔ دینِ حق نے اسے اللہ کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کے لیے نماز کی صورت مقرر کر دی۔ انسان غیر اللہ کے سامنے مالی نذرانے پیش کرتا تھا، دینِ حق نے اسے اللہ کے لیے خاص کر دیا اور اس کی عملی صورت زکوٰۃ مقرر کر دی۔ انسان غیر اللہ کے نام پر روزے رکھتا تھا۔ دینِ حق نے اسے بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا (باقی صفحہ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

النمل

نام | دوسرے رکوع کی چوتھی آیت میں وَادِ النَّمل کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا نام اسی سے ماخوذ ہے یعنی وہ سورۃ جس میں النمل کا قصہ مذکور ہے۔ یا جس میں النمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔

زمانۂ نزول | مضمون اور انداز بیان مکّہ کے دَور متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے۔ اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عباسؓ اور جابر بن زیدؒ کا بیان ہے کہ "پہلے سورۂ شعراء نازل ہوئی، پھر النمل، پھر القصص"۔

موضوع اور مباحث | یہ سورۃ دو خطبوں پر مشتمل ہے۔ پہلا خطبہ آغاز سورہ سے چوتھے رکوع کے خاتمے تک ہے۔ اور دوسرا خطبہ پانچویں رکوع کی ابتدا سے سورۃ کے اختتام تک

پہلے خطبے میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رہنمائی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کی بشارتوں کے مستحق بھی صرف وہی لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں کو تسلیم کریں جنہیں یہ کتاب اس کائنات کی بنیادی حقیقتوں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، اور پھر مان لینے کے بعد اپنی عملی زندگی میں بھی اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کریں۔ لیکن اس راہ پر آنے اور چلنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مانع ہوتی ہے وہ انکارِ آخرت ہے۔ کیونکہ یہ آدمی کو غیر ذمہ دار، بندۂ نفس اور فریفتۂ حیاتِ دنیا بنا دیتا ہے، جس کے بعد آدمی کا خدا کے آگے جھکنا اور اپنے نفس کی خواہشات پر اخلاقی پابندیاں برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس تمہید کے بعد تین قسم کی سیرتوں کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

ایک نمونہ فرعون اور سردارانِ قومِ ثمود اور سرکشانِ قومِ لوطؑ کا ہے جن کی سیرت

فکرِ آخرت سے بے نیازی اور نتیجۃً نفس کی بندگی سے تعمیر ہوئی تھی۔ یہ لوگ کسی نشانی کو دیکھ کر بھی ایمان لانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہ اُلٹے ان لوگوں کے دشمن ہو گئے جنہوں نے ان کو خیر و صلاح کی طرف بلایا۔ انہوں نے اپنی اُن بدکاریوں پر بھی پورا اصرار کیا جن کا گھناؤنا پن کسی صاحبِ عقل انسان سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انہیں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے سے ایک لمحہ پہلے بھی ہوش نہ آیا۔

دوسرا نمونہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہے جن کو خدا نے دولت، حکومت، اور شوکت و حشمت سے اس پیمانے پر نوازا تھا کہ کفارِ مکہ کے سردار اس کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود چونکہ وہ اپنے آپ کو خدا کے حضور جواب دہ سمجھتے تھے، اور انہیں احساس تھا کہ انہیں جو کچھ بھی حاصل ہے خدا کی عطا سے حاصل ہے، اس لیے ان کا سر ہر وقت منعمِ حقیقی کے آگے جھکا رہتا تھا اور کبرِ نفس کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک ان کی سیرت و کردار میں نہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا نمونہ ملکۂ سبا کا ہے جو تاریخ عرب کی نہایت مشہور دولت مند قوم پر حکمراں تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرورِ نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کر سکتا ہے وہ سردارانِ قریش کی بہ نسبت لاکھوں درجے زیادہ اسے حاصل تھیں۔ پھر وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ تقلیدِ آبائی کی بنا پر بھی، اور اپنی قوم میں اپنی سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی، اس کے لیے دینِ شرک کو چھوڑ کر دینِ توحید اختیار کرنا اس سے بہت زیادہ مشکل تھا جتنا کسی عام مشرک کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اسے قبولِ حق سے نہ روک سکی، کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا۔ خدا کے حضور جواب دہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

دوسرے خطبے میں سب سے پہلے کائنات کے چند نمایاں ترین مشہود حقائق کی طرف اشارے کرکے کفارِ مکہ سے پے در پے سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ، یہ حقائق اس شرک کی شہادت دے رہے ہیں جس میں تم مبتلا ہو، یا اُس توحید پر گواہ ہیں جس کی دعوت اِس قرآن میں تمہیں دی جارہی ہے؟ اس کے بعد کفار کے اصل مرض پر انگلی رکھ دی گئی ہے کہ جس چیز نے ان کو اندھا بنا رکھا ہے، جس کی وجہ سے وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتے اور سب کچھ سُن کر بھی کچھ نہیں سنتے وہ دراصل آخرت کا انکار ہے۔ اسی چیز نے ان کے لیے زندگی کے کسی مسئلے میں بھی کوئی سنجیدگی باقی نہیں چھوڑی ہے، کیونکہ جب ان کے نزدیک آخر کار سب کچھ مٹی ہوجانا ہے، اور حیاتِ دنیا کی اس ساری تگ و دو کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے تو آدمی کے لیے پھر حق اور باطل سب یکساں ہیں۔ اس کے لیے اس سوال ہی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ اس کا نظامِ حیات راستی پر قائم ہے یا ناراستی پر۔

لیکن اس بحث سے مقصود یہ نہیں ہے کہ جب یہ لوگ غفلت میں مگن ہیں تو انہیں دعوت دینا بے کار ہے۔ بلکہ دراصل اس سے مقصود سونے والوں کو جھنجوڑ کر جگانا ہے۔ اس لیے چھٹے اور ساتویں رکوع میں پے در پے وہ باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جو لوگوں میں آخرت کا احساس بیدار کریں، اس سے غفلت کے نتائج پر متنبہ کریں، اور انہیں اس کی آمد کا اس طرح یقین دلائیں جس طرح ایک آدمی اپنی آنکھوں دیکھی بات کا اُس شخص کو یقین دلاتا ہے جس نے اسے نہیں دیکھا ہے۔

خاتمۂ کلام میں قرآن کی اصل دعوت، یعنی خدائے واحد کی بندگی کی دعوت، نہایت مختصر، مگر انتہائی مؤثر انداز میں پیش کرکے لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اسے قبول کرنا تمہارے اپنے لیے نافع اور اسے رد کرنا تمہارے اپنے لیے ہی نقصان دہ ہے۔ اسے ماننے کے لیے اگر خدا کی وہ نشانیاں دیکھنے کا انتظار کروگے جن کے سامنے آجانے

کے بعد ماننے بغیر چارہ نہ رہے گا، تو یاد رکھو کہ وہ فیصلے کا وقت ہوگا، اس وقت ماننے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

طٰسٓ۔ یہ آیات ہیں قرآن اور کتابِ مبینؔ کی، ہدایت اور بشارتؔ ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیںؔ اور وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت کا یقین رکھتے

۱؎ "کتابِ مبین" کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی تعلیمات اور اپنے احکام اور ہدایات کو بالکل واضح طریقے سے بیان کرتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ وہ حق اور باطل کا فرق نمایاں طریقے سے کھول دیتی ہے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کا کتاب الٰہی ہونا ظاہر ہے، جو کوئی اسے آنکھیں کھول کر پڑھے گا اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا کلام نہیں ہے۔

۲؎ یعنی یہ آیات ہدایت اور بشارت ہیں۔ "ہدایت کرنے والی" اور "بشارت دینے والی" کہنے کے بجائے انہیں بجائے خود "ہدایت اور بشارت" کہا گیا جس سے رہنمائی اور بشارت کے وصف میں ان کے کمال کا اظہار مقصود ہے، جیسے کسی کو آپ سخی کہنے کے بجائے مجسم سخاوت اور حسین کہنے کے بجائے از سرتا پا حسن کہیں۔

۳؎ یعنی قرآن مجید کی یہ آیات رہنمائی بھی صرف انہی لوگوں کی کرتی ہیں اور انجام نیک کی خوشخبری بھی صرف انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کریں، خدائے واحد کو اپنا ایک ہی الٰہ اور رب مان لیں، قرآن کو خدا کی کتاب تسلیم کریں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق مان کر اپنا پیشوا بنالیں، اور یہ عقیدہ بھی اختیار کرلیں کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں ہم کو اپنے اعمال کا حساب دینا اور جزائے اعمال سے دوچار ہونا ہے۔ پھر ان چیزوں کو محض مان کر نہ رہ جائیں بلکہ عملاً اتباع و اطاعت کے لیے تیار ہوں جس کی اولین علامت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہ دونوں شرطیں جو لوگ پوری کردیں گے انہی کو قرآن کی آیات دنیا میں زندگی کا سیدھا راستہ بتائیں گی، اس

ہیں ؎ ۔ (برعکس اس کے) جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے در حقیقت ہم نے اُن کے کرتوتوں

راستہ کے ہر مرحلے میں ان کو صحیح اور غلط کا فرق سمجھائیں گی، اس کے ہر موڑ پر انہیں غلط راہوں کی طرف جانے سے بچائیں گی، اور ان کو یہ اطمینان بخشیں گی کہ راست روی کے نتائج دنیا میں خواہ کچھ بھی ہوں، آخرکار ابدی اور دائمی فلاح اسی کی بدولت انہیں حاصل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے سرفراز ہونگے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک معلّم کی تعلیم سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس پر اعتماد کرکے واقعی اس کی شاگردی قبول کرے اور اس کی ہدایات کے مطابق کام بھی کرے۔ ایک ڈاکٹر سے استفادہ وہی مریض کر سکتا ہے جو اسے اپنا معالج بنائے اور دوا اور پرہیز وغیرہ کے معاملہ میں اس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اسی صورت میں معلّم اور ڈاکٹر یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آدمی کو نتائج مطلوبہ حاصل ہونگے۔

بعض لوگوں نے اس آیت میں يُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اختیار کریں۔ لیکن قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ایتاءِ زکوٰۃ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد وہ زکوٰۃ ادا کرنا ہے جو نماز کے ساتھ اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ علاوہ بریں زکوٰۃ کے لیے ایتاء کا لفظ استعمال ہوا ہے جو زکوٰۃِ مال ادا کرنے کے معنی متعین کر دیتا ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں پاکیزگی اختیار کرنے کے لیے تزکّی کا لفظ بولا جاتا ہے نہ کہ ایتاءِ زکوٰۃ۔ دراصل یہاں جو بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت و اتباع کا رویہ اختیار کرنا بھی ضروری ہے اور اقامتِ صلوٰۃ و ایتاءِ زکوٰۃ وہ پہلی علامت ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ آدمی نے واقعی اطاعت قبول کر لی ہے۔ یہ علامت جہاں غائب ہوئی وہاں فوراً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی سرکش ہے، حاکم کو حاکم چاہے اس نے مان لیا ہو، مگر حکم کی پیروی کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔

؎ اگرچہ آخرت کا عقیدہ ایمانیات میں شامل ہے اور اس بنا پر "ایمان لانے والوں" سے مراد ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہیں جو توحید اور رسالت کے ساتھ آخرت پر بھی ایمان لائیں، لیکن ایمانیات کے ضمن میں اس کے آپ سے آپ شامل ہونے کے باوجود یہاں اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے خاص طور پر زور دے کر اسے الگ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ جو

کو خوشنما بنا دیا ہے، اس لیے وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۵۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے بری سزا ہے۶ اور

لوگ آخرت کے قائل نہ ہوں ان کے لیے اس قرآن کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنا بلکہ اس پر قدم رکھنا بھی محال ہے۔ کیونکہ اس طرزِ فکر کے لوگ طبعاً اپنا معیارِ خیر و شر صرف اُنہی نتائج سے متعین کرتے ہیں جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لیے کسی ایسی نصیحت و ہدایت کو قبول کرنا ممکن نہیں ہوتا جو انجامِ اُخروی کو سود و زیاں اور نفع و نقصان کا معیار قرار دے کر خیر و شر کا تعین کرتی ہو۔ ایسے لوگ اول تو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم پر کان ہی نہیں دھرتے، لیکن اگر کسی وجہ سے وہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو بھی جائیں تو آخرت کا یقین نہ ہونے کے باعث ان کے لیے ایمان و اسلام کے راستے پر ایک قدم چلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس راہ میں پہلی ہی آزمائش جب پیش آئے گی، جہاں دنیوی فائدے اور اُخروی نقصان کے تقاضے انہیں دو مختلف سمتوں میں کھینچیں گے تو وہ بے تکلف دنیا کے فائدے کی طرف کھنچ جائیں گے اور آخرت کے نقصان کی ذرہ برابر پروا نہ کریں گے، خواہ زبان سے وہ ایمان کے کتنے ہی دعوے کرتے رہیں۔

۵؎ یعنی خدا کا قانونِ فطرت یہ ہے، نفسیاتِ انسانی کی فطری منطق یہی ہے کہ جب آدمی زندگی اور اس کی سعی و عمل کے نتائج کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھے گا، جب وہ کسی ایسی عدالت کا قائل نہ ہو گا جہاں انسان کے پورے کارنامۂ حیات کی جانچ پڑتال کر کے اس کے حسن و قبح کا آخری اور قطعی فیصلہ کیا جانے والا ہو، اور جب وہ موت کے بعد کسی ایسی زندگی کا قائل نہ ہو گا جس میں حیاتِ دنیا کے اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کے مطابق ٹھیک جزا و سزا دی جانے والی ہو، تو لازماً اس کے اندر ایک مادہ پرستانہ نقطۂ نظر نشوونما پائے گا۔ اسے حق اور باطل، شرک اور توحید، نیکی اور بدی، اخلاق اور بداخلاقی کی ساری بحثیں سراسر بے معنی نظر آئیں گی۔ جو کچھ اسے اس دنیا میں لذت و عیش اور مادّی ترقی و خوشحالی اور قوت و اقتدار سے ہمکنار کرے وہی اس کے نزدیک بھلائی ہو گی قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی طرزِ زندگی اور نظامِ اخلاق ہو۔ اس کو حقیقت اور صداقت سے دراصل کوئی غرض ہی نہ ہو گی۔ اس کی اصل مطلوب صرف حیاتِ دنیا کی زینتیں اور کامرانیاں ہوں گی جن کے حصول کی فکر اسے ہر وادی میں لیے بھٹکتی پھرے گی۔

آخرت میں یہی سب سے زیادہ خسارے میں رہنے والے ہیں۔ اور (اے محمدؐ) بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو ۔^ے

(انہیں اُس وقت کا قصہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا^ے

اور اس مقصد کے لیے جو کچھ بھی وہ کرے گا اسے اپنے نزدیک بڑی خوبی کی بات سمجھے گا اور اُلٹا اُن لوگوں کو بے وقوف سمجھے گا جو اس کی طرح دنیا طلبی میں منہمک نہیں ہیں اور اخلاق و بداخلاقی سے بے نیاز ہو کر ہر کام کر گزرنے میں بیباک نہیں ہیں

کسی کے اعمالِ بد کو اس کے لیے خوشنما بنا دینے کا یہ فعل قرآن مجید میں کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس سے مراد، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہوتی ہے کہ فطرۃ اللہ کے مطابق جو شخص یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے اسے زندگی کا یہ ہنجار خوش آئند ہی محسوس ہوا ہے۔ اور جب وہ شیطان کی طرف منسوب ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اختیار کر لینے والے آدمی کے سامنے شیطان ہر وقت ایک خیالی جنت پیش کرتا رہتا ہے اور اسے خوب اطمینان دلاتا ہے کہ شاباش برخوردار، بہت اچھے جا رہے ہو۔

ے اس بری سزا کی صورت، وقت اور جگہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے کیونکہ یہ اس دنیا میں بھی مختلف افراد گروہوں اور قوموں کو بے شمار مختلف طریقوں سے ملتی ہے، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت عین موت کے دروازے پر بھی اس کا ایک حصہ ظالموں کو پہنچتا ہے، موت کے بعد عالمِ برزخ میں بھی اس سے آدمی دوچار ہوتا ہے، اور پھر روزِ حشر سے تو اس کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا جو پھر کہیں جا کر ختم نہ ہوگا۔

ے یعنی یہ کوئی ہوائی باتیں نہیں ہیں جو اس قرآن میں کی جا رہی ہیں، اور نہ یہ کسی انسان کے قیاس و رائے پر مبنی ہیں بلکہ انہیں ایک حکیم و علیم ذات القا کر رہی ہے جو حکمت و دانائی اور علم و دانش میں کامل ہے، جسے اپنی خلق کے مصالح اور ان کے ماضی و حال اور مستقبل کا پورا علم ہے، اور جس کی حکمت بندوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے بہترین تدبیر اختیار کرتی ہے۔

ے یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین میں آٹھ دس سال گزارنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو ساتھ لیکر کوئی ٹھکانہ تلاش کرنے جا رہے تھے۔ مدین کا علاقہ خلیج عقبہ کے کنارے عرب اور جزیرہ نمائے سینا

کہ "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو۔[۹] وہاں جو پہنچا تو ندا آئی[۱۰] کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ

کے سواحل پر واقع تھا۔ وہاں سے چل کر حضرت موسیٰ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اُس مقام پر پہنچے جو اب کوہ سینا کے نام سے مشہور ہے۔ اسی کے دامن میں وہ واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

یہاں جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کی تفصیلات اس سے پہلے سورۂ طٰہٰ (رکوع ۱) میں گزر چکی ہیں اور آگے سورۂ قصص (رکوع ۴) میں آ رہی ہیں۔

۹ فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رات کا وقت اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور حضرت موسیٰ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے جس سے انہیں کچھ زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ میں جا کر معلوم کرتا ہوں یہ کونسی بستی ہے جہاں آگ جل رہی ہے، آگے کدھر کدھر راستے جاتے ہیں اور کون کون سی بستیاں قریب ہیں۔ تاہم اگر وہ بھی ہماری ہی طرح کوئی چلتے پھرتے مسافر ہوئے جن سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں تو کم از کم میں کچھ انگارے ہی لے آؤں گا کہ تم لوگ آگ جلا کر کچھ گرمی حاصل کر سکو۔

۱۰ سورۂ قصص میں ہے کہ ندا ایک درخت سے آ رہی تھی، فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اس سے جو صورتِ معاملہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ وادی کے کنارے ایک خطے میں آگ سی لگی ہوئی تھی مگر نہ کچھ جل رہا تھا نہ کوئی دھواں اٹھ رہا تھا اور اس آگ کے اندر ایک ہرا بھرا درخت کھڑا تھا جس پر سے یکایک یہ ندا آنی شروع ہوئی۔

یہ ایک عجیب معاملہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی مرتبہ نبوت سے سرفراز کیے گئے تو غارِ حرا کی تنہائی میں یکایک ایک فرشتہ آیا اور اس نے اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک شخص سفر کرتا ہوا ایک جگہ ٹھیرا ہے، دُور سے آگ دیکھ کر راستہ پوچھنے یا انگارا چننے کی غرض سے آتا ہے اور یکلخت اللہ رب العالمین کی ہر قیاس و گمان سے بالا ذات اس سے مخاطب ہو جاتی ہے۔ ان مواقع پر ضرور کوئی ایسی غیر معمولی کیفیت خارج میں بھی اور انبیاء علیہم السلام کے نفس میں بھی ہوتی ہوگی جس کی

میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا پروردگار۔[11] اے موسیٰؑ! یہ میں ہوں اللہ، زبردست اور دانا۔ اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی۔" جونہی کہ موسیٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے[12] تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ "اے موسیٰ، ڈرو نہیں، میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے[13]، الا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو۔[14] پھر اگر برائی کے بعد اس نے

بتا پڑا انہیں اس امر کا یقین حاصل ہو جاتا ہوگا کہ یہ کسی جنّ یا شیطان یا خود ان کے اپنے ذہن کا کوئی کرشمہ نہیں ہے، نہ ان کے حواس کوئی دھوکا کھا رہے ہیں، بلکہ فی الواقع یہ خداوند عالم یا اس کا فرشتہ ہی ہے جو ان سے ہمکلام ہے۔

[11] اس موقع پر "سبحان اللہ" ارشاد فرمانے سے دراصل حضرت موسیٰ کو اس بات پر متنبہ کرنا مقصود تھا کہ یہ معاملہ کمال درجہ تنزیہ کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ رب العالمین اس درخت پر بیٹھا ہو، یا اس میں حلول کر آیا ہو، یا اس کا نور مطلق تمہاری بینائی کے حدود میں سما گیا ہو، یا کوئی زبان کسی منہ میں حرکت کر کے یہاں کلام کر رہی ہو، بلکہ ان تمام محدودیتوں سے پاک اور منزّہ ہوتے ہوئے وہ بذاتِ خود تم سے مخاطب ہے۔

[12] سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں اس کے لیے ثُعبان (اژدہے) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہاں اسے "جان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو چھوٹے سانپ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جسامت میں وہ اژدہا تھا، مگر اس کی حرکت کی تیزی ایک چھوٹے سانپ جیسی تھی۔ اسی مفہوم کو سورۂ طٰہٰ میں حَيَّةٌ تَسْعٰى (دوڑتے ہوئے سانپ) کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

[13] یعنی میرے حضور اس امر کا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ رسالت کے منصبِ عظیم پر مقرر کرنے کے لیے جب میں کسی کو اپنی پیشی میں بلاتا ہوں تو اس کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہوں۔ اس لیے خواہ کیسا ہی کوئی غیر معمولی معاملہ پیش آئے رسول کو بے خوف اور مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس کے لیے وہ کسی طرح ضرر رساں نہ ہوگا۔

[14] یہ استثناء متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ متصل ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خوف

بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں[۱۵]۔ اور ذرا اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں تو ڈالو، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ (دو نشانیاں) نَو نشانیوں میں سے ہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف (لے جانے کے لیے)[۱۶]، وہ بڑے بدکردار لوگ ہیں۔"

کی معقول وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہ کہ رسول سے کوئی قصور سرزد ہوا ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں مراد یہ ہو گی کہ میرے حضور تو کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے جب تک کہ آدمی قصوروار نہ ہو

[۱۵] یعنی قصور کرنے والا بھی اگر توبہ کر کے اپنے رویّے کی اصلاح کر لے اور برے عمل کے بجائے نیک عمل کرنے لگے تو میرے ہاں اس کے لیے عفو و درگزر کا دروازہ کھلا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ارشاد فرمانے سے مقصود ایک تنبیہ بھی تھی اور بشارت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نادانستگی میں ایک قبطی کو قتل کر کے مصر سے نکلے تھے۔ یہ ایک قصور تھا جس کی طرف لطیف اشارہ فرما دیا گیا۔ پھر جس وقت یہ قصور اچانک بلا ارادہ ان سے سرزد ہوا تھا اس کے بعد فوراً ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی تھی کہ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ (اے پروردگار، میں اپنے نفس پر ظلم کر گزرا، مجھے معاف فرما دے) اور اللہ تعالیٰ نے اسی وقت انہیں معاف بھی فرما دیا تھا۔ فَغَفَرَ لَہٗ (القصص، آیت ۱۶)۔ اب یہاں اسی معافی کی بشارت انہیں دی گئی ہے۔ گویا مطلب اس تقریر کا یہ ہوا کہ اے موسیٰ میرے حضور تمہارے لیے ڈرنے کی ایک وجہ تو ضرور ہو سکتی تھی، کیونکہ تم سے ایک قصور سرزد ہو گیا تھا، لیکن جب تم اس برائی کو بھلائی سے بدل چکے ہو تو میرے پاس تمہارے لیے اب مغفرت اور رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کوئی سزا دینے کے لیے اس وقت میں نے تمہیں نہیں بلایا ہے بلکہ بڑے بڑے معجزات دے کر میں تمہیں ایک کارِ عظیم پر بھیجنے والا ہوں۔

[۱۶] سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ موسیٰ کو ہم نے صریح طور پر نظر آنے والی نو نشانیاں (تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ) عطا فرمائی تھیں۔ اور سورۂ اعراف میں ان کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے (۱) لاٹھی جو اژدہا بن جاتی تھی۔ (۲) ہاتھ جو بغل سے سورج کی طرح چمکتا ہوا نکلتا تھا۔ (۳) جادوگروں کو برسرِ عام شکست دینا (۴) حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط۔ (۵) طوفان (۶) ٹڈی دل

مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں ان لوگوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انہوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے[۱۷] اب دیکھ لو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا ع

(دوسری طرف) ہم نے داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا[۱۸] اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا

(۷) تمام غلے کے ذخیروں میں سرسریاں اور انسان و حیوان سب میں جوئیں (۸) مینڈکوں کا طوفان (۹) اور خون۔

۱۷ قرآن میں دوسرے مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کے اعلان کے مطابق کوئی بلائے عام مصر پر نازل ہوتی تھی تو فرعون حضرت موسیٰ سے کہتا تھا کہ تم اپنے خدا سے دعا کر کے اس بلا کو ٹلوا دو، پھر جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہم مان لیں گے۔ مگر جب وہ بلا ٹل جاتی تھی تو فرعون اپنی اُسی ہٹ دھرمی پر تُل جاتا تھا (الاعراف آیت ۱۳۴۔ الزخرف: آیت ۴۹۔۵۰)۔ بائیبل میں بھی اس کا ذکر موجود ہے (خروج باب ۸ تا ۱۰)۔ اور ویسے بھی یہ بات کسی طرح تصور میں نہ آسکتی تھی کہ ایک پورے ملک پر قحط اور طوفان اور ٹڈی دلوں کا ٹوٹ پڑنا اور مینڈکوں اور سُرسُریوں کے بے شمار لشکروں کا امنڈ آنا کسی جادو کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایسے کھلے ہوئے معجزے تھے جن کو دیکھ کر ایک بے وقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا تھا کہ پیغمبر کے کہنے پر ایسی ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کے کہنے پر ان کا دور ہو جانا صرف اللہ رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے فرعون سے صاف کہہ دیا تھا کہ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ” تو خوب جان چکا ہے کہ یہ نشانیاں مالک زمین و آسمان کے سوا کسی اور نے نازل نہیں کی ہیں“ (بنی اسرائیل، آیت ۱۰۲)۔ لیکن جس وجہ سے فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں نے جان بوجھ کر ان کا انکار کیا وہ یہ تھی کہ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ” کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے“ (المومنون، آیت ۴۷)

۱۸ یعنی حقیقت کا علم۔ اس بات کا علم کہ درحقیقت ان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ ہے اللہ کا عطیہ ہے، اور اُس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی اُن کو بخشے گئے ہیں انہیں اللہ ہی کی مرضی

جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی[19]۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا[20]

کے مطابق استعمال کیا جانا چاہیے، اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر انہیں مالک حقیقی کے حضور جوابدہی کرنی ہے۔ یہ علم اس جہالت کی ضد ہے جس میں فرعون مبتلا تھا۔ اس جہالت نے جو سیرت تعمیر کی تھی اس کا نمونہ اوپر مذکور ہوا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ یہ علم کیسی سیرت کا نمونہ تیار کرتا ہے۔ بادشاہی، دولت، حشمت، طاقت دونوں طرف یکساں ہے۔ فرعون کو بھی یہ ملی تھی اور داؤد و سلیمان علیہما السلام کو بھی۔ لیکن جہالت اور علم کے فرق نے ان کے درمیان کتنا عظیم الشان فرق پیدا کر دیا۔

19؎ یعنی دوسرے مومن بندے بھی ایسے موجود تھے جن کو خلافت عطا کی جا سکتی تھی۔ لیکن یہ ہماری کوئی ذاتی خوبی نہیں بلکہ محض اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس مملکت کی فرمانروائی کے لیے منتخب فرمایا۔

20؎ وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤدؑ کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض تقسیم بھی ہوتی ہو تو وہ حضرت سلیمان کے لیے خاص نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ حضرت داؤد کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔ اس لیے اس آیت کو اس حدیث کی تردید میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ لا نورث ما ترکنا صدقۃ "ہم انبیاء کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے" (بخاری، کتاب فرض الخمس)، اور ان النبی لا یورث انما میراثہ فی فقراء المسلمین والمساکین "نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقراء اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے" (مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق حدیث نمبر ۶۰ و ۷۸)

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کا اصل عبرانی نام سولومون تھا جو "سلیم" کا ہم معنی ہے۔ ۹۶۵ قبل مسیح میں حضرت داؤد کے جانشین ہوئے اور ۹۲۶ ق م تک تقریباً ۴۰ سال فرمانروا رہے۔ ان کے حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم ص ۹۵-۹۷ اور حواشی سورۂ انبیاء رکوع ۶۔ ان کے حدودِ سلطنت کے متعلق ہمارے مفسرین نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ وہ انہیں دنیا کے بہت بڑے حصے کا حکمران بتاتے ہیں، حالانکہ ان کی مملکت صرف موجودہ

اور اس نے کہا "لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں[۲۱] اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں[۲۲]، بے شک یہ (اللہ کا) نمایاں فضل ہے"۔ سلیمان کے لیے جن اور انسان اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے[۲۳] اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ

فلسطین و شرق اردن پر مشتمل تھی اور شام کا ایک حصہ بھی اس میں شامل تھا۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ملک سلیمان، تفہیم القرآن جلد دوم ص ۵۹۸)

۲۱؎ بائیبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمان کو پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا تھا لیکن بنی اسرائیل کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے (جیوش انسائکلوپیڈیا۔ جلد ۱۱۔ ص ۴۳۹)۔

۲۲؎ یعنی اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے۔ اسے لفظی معنوں میں لینا درست نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اللہ کے بخشے ہوئے مال و دولت اور ساز و سامان کی کثرت ہے۔ یہ بات حضرت سلیمان نے فخریہ نہیں فرمائی تھی بلکہ اللہ کے فضل اور اس کی عطا و بخشش کا شکریہ ادا کرنا مقصود تھا۔

۲۳؎ بائیبل میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جن حضرت سلیمان کے لشکروں میں شامل تھے اور وہ ان سے خدمت لیتے تھے۔ لیکن تلمود اور ربیوں کی روایات میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے (جیوش انسائکلوپیڈیا ج ۱۱ ص ۴۴۰)۔ موجودہ زمانہ کے بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ جن اور طیر سے مراد جنات اور پرندے نہیں ہیں بلکہ انسان ہی ہیں جو حضرت سلیمان کے لشکر میں مختلف کام کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن سے مراد پہاڑی قبائل کے وہ لوگ ہیں جنہیں حضرت سلیمان نے مسخر کیا تھا اور وہ ان کے ہاں حیرت انگیز طاقت اور محنت کے کام کرتے تھے۔ اور طیر سے مراد گھوڑ سواروں کے دستے ہیں جو پیدل دستوں کی بہ نسبت بہت زیادہ تیزی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ لیکن یہ قرآن مجید میں تاویل کی بدترین مثالیں ہیں۔ قرآن یہاں جن، انس اور طیر، تین الگ الگ اقسام کے لشکر بیان کر رہا ہے اور تینوں پر ال تعریف جنس کے لیے لایا گیا ہے۔ اس لیے لامحالہ الجن اور الطیر، الانس میں شامل نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اس سے مختلف دو الگ اجناس ہی ہو سکتی ہیں۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو عربی زبان سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہو، یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس زبان میں محض لفظ الجن بول کر انسانوں کا

کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو"

کوئی گروہ، یا محض الطیر بول کر سواروں کا رسالہ کبھی مراد لیا جا سکتا ہے اور کوئی عرب ان الفاظ کو سن کر ان کے یہ معنی سمجھ سکتا ہے۔ محض محاورے میں کسی انسان کو اس کے فوق العادہ کام کی وجہ سے جن، یا کسی عورت کو اس کے حسن کی وجہ سے پری، اور کسی تیز رفتار آدمی کو پرندہ کہہ دینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اب جن کے معنی طاقت ور آدمی اور پری کے معنی حسین عورت اور پرندے کے معنی تیز رفتار انسان کے ہو جائیں۔ ان الفاظ کے یہ معنی تو مجازی ہیں نہ کہ حقیقی اور کسی کلام میں کسی لفظ کو حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنوں میں صرف اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے، اور سننے والے بھی ان کو مجازی معنوں میں صرف اسی وقت لے سکتے ہیں جبکہ آس پاس کوئی واضح قرینہ ایسا موجود ہو جو اس کے مجاز ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ یہاں آخر کونسا قرینہ پایا جاتا ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکے کہ جن اور طیر کے الفاظ اپنے حقیقی لغوی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں؟ بلکہ آگے ان دونوں گروہوں کے ایک ایک فرد کا جو حال اور کام بیان کیا گیا ہے وہ تو اس تاویل کے بالکل خلاف ہی ایک صریح قرینہ ہے۔ کسی شخص کا دل اگر قرآن کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو تو اسے صاف کہنا چاہیے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا۔ لیکن یہ بڑی اخلاقی بزدلی اور علمی خیانت ہے کہ آدمی قرآن کے صاف صاف الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے من مانے معنی پر ڈھالے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ قرآن کے بیان کو مانتا ہے۔ حالانکہ دراصل قرآن جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اسے نہیں بلکہ خود اپنے زبردستی گھڑے ہوئے مفہوم کو مانتا ہے۔

ؔ۲۴ اس آیت کو بھی آج کل کے بعض مفسرین نے تاویل کے خراد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی اور نملۃ کے معنی ایک چیونٹی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔ اس طرح وہ آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "جب حضرت سلیمان وادی النمل میں پہنچے تو ایک نملی نے کہا کہ اے قبیلۂ نمل کے لوگو۔۔۔" لیکن یہ بھی ایسی تاویل ہے جس کا ساتھ قرآن کے الفاظ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض

سلیمان اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا ____ "اے میرے رب، مجھے

وادی النمل کو اس وادی کا نام مان لیا جائے، اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنی النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا، تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے بالکل خلاف ہے کہ قبیلۂ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے۔ اگرچہ جانوروں کے نام پر عرب کے بہت سے قبائل کے نام ہیں، مثلاً کلب، اسد وغیرہ۔ لیکن کوئی عرب قبیلۂ کلب کے کسی فرد کے متعلق قال کلب (ایک کتے نے یہ کہا) یا قبیلۂ اسد کے کسی شخص کے متعلق قال اسدٌ (ایک شیر نے کہا)، ہرگز نہیں بولے گا۔ اس لیے بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قالت نملۃٌ (ایک چیونٹی یہ بولی)، قطعاً عربی محاورہ و استعمال کے خلاف ہے۔ پھر قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ "اے نملیو، اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو" بالکل بے معنی ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کچلا کرتا۔ اگر وہ حملے کی نیت سے آیا ہو تو گھروں میں گھسنا لاحاصل ہے۔ حملہ آور اس کے گھروں میں گھس کر اسے زیادہ اچھی طرح کچلیں گے۔ اور اگر وہ محض کوچ کرتا ہوا گزر رہا ہو تو اس کے لیے بس راستہ صاف چھوڑ دینا کافی ہے۔ کوچ کرنے والوں کی لپیٹ میں آکر انسانوں کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ چلتے ہوئے انسان بے خبری میں انسانوں کو کچل ڈالیں۔ لہٰذا اگر بنی النمل کوئی انسانی قبیلہ ہوتا اور اس کا کوئی فرد اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تو حملے کے خطرے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو، بھاگ چلو اور پہاڑوں میں پناہ لو تاکہ سلیمان کے لشکر تمہیں تباہ نہ کر دیں۔" اور حملے کا خطرہ نہ ہونے کی صورت میں وہ کہتا کہ "اے نملیو راستے سے ہٹ جاؤ تاکہ تم میں سے کوئی شخص سلیمان کے لشکروں کی جھپیٹ میں نہ آجائے۔"

یہ تو وہ غلطی ہے جو اس تاویل میں عربی زبان اور مضمونِ عبارت کے اعتبار سے ہے۔ رہی یہ بات کہ وادی النمل دراصل اس وادی کا نام تھا، اور وہاں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ رہتا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کے لیے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے انہوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قتادہ اور مقاتل کہتے ہیں،

قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین

کہ وادی بارض الشام کثیر النمل، وہ ایک وادی ہے سرزمین شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں۔ لیکن تاریخ و جغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اس وادی میں بنی النمل نامی کوئی قبیلہ بھی رہتا تھا۔ یہ صرف ایک من گھڑت ہے جو اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لیے وضع کر لی گئی ہے۔

بنی اسرائیل کی روایات میں بھی یہ قصہ پایا جاتا ہے، مگر اس کا آخری حصہ قرآن کے خلاف ہے اور حضرت سلیمانؑ کی شان کے خلاف بھی ہے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ جب ایک وادی سے گزر رہے تھے جس میں چیونٹیاں بہت تھیں تو انہوں نے سنا کہ ایک چیونٹی پکار کر دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی ہے کہ "اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ ورنہ سلیمان کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں گے۔" اس پر حضرت سلیمان نے اس چیونٹی کے سامنے بڑے تکبر کا اظہار کیا اور جواب میں اس چیونٹی نے ان سے کہا کہ تمہاری حقیقت کیا ہے، ایک حقیر بوند سے تو تم پیدا ہوئے ہو۔ یہ سن کر حضرت سلیمان شرمندہ ہو گئے (جیوئش انسائیکلوپیڈیا، ج ۱۱، ص ۴۴۰)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کس طرح بنی اسرائیل کی غلط روایات کی تصحیح کرتا ہے اور ان گندگیوں کو صاف کرتا ہے جو انہوں نے خود اپنے پیغمبروں کی سیرتوں پر ڈال دی تھیں۔ ان روایات کے متعلق مغربی مستشرقین بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے سب کچھ ان سے سرقہ کر لیا ہے۔

عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بھی بعید نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمان نے اس کی بات کیسے سن لی، تو جس شخص کے حواس کلام وحی جیسی لطیف چیز کا ادراک کر سکتے ہوں، اس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف (CRUDE) چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

۲۵ے اصل الفاظ ہیں رَبِّ اَوْزِعْنِیْ۔ وزع کے اصل معنی عربی زبان میں روکنے کے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سلیمان کا یہ کہنا کہ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ (مجھے روک کہ میں تیرے احسان کا شکر ادا کروں)، ہمارے نزدیک دراصل یہ معنی دیتا ہے کہ اے میرے رب جو عظیم الشان قوتیں اور قابلیتیں

پر کیا ہے اور ایسا عملِ صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر[۲۶]۔"

تو نے مجھے دی ہیں وہ ایسی ہیں کہ اگر میں ذرا سی غفلت میں بھی مبتلا ہو جاؤں تو حدِ بندگی سے خارج ہو کر اپنی کبریائی کے خبط میں نہ معلوم کہاں سے کہاں نکل جاؤں۔ اس لیے اے میرے پروردگار تو مجھے قابو میں رکھ تاکہ میں کافرِ نعمت بننے کے بجائے شکرِ نعمت پر قائم رہوں۔

۲۶؎ صالح بندوں میں داخل کرنے سے مراد غالباً یہ ہے کہ آخرت میں میرا انجام صالح بندوں کے ساتھ ہو اور میں ان کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ اس لیے کہ آدمی جب عملِ صالح کرے گا تو صالح تو وہ آپ سے آپ ہو گا ہی، البتہ آخرت میں کسی کا جنت میں داخل ہونا محض اس کے عملِ صالح کے بل بوتے پر نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لن یدخل احد کم الجنۃ عملہ "تم میں سے کسی کو بھی محض اس کا عمل جنت میں نہیں پہنچا دیگا" عرض کیا گیا کہ ولا انت یا رسول اللہ "کیا حضورؐ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ تعالٰی برحمتہ۔ "ہاں، میں بھی محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنت میں نہ چلا جاؤنگا جب تک اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے نہ ڈھانک لے۔"

حضرت سلیمان کی یہ دعا اس موقع پر بالکل بے محل ہو جاتی ہے اگر النمل سے مراد انسانوں کا کوئی قبیلہ لے لیا جائے اور نملۃ کے معنی قبیلۂ نمل کے ایک فرد کے لے لیے جائیں۔ ایک بادشاہ کے لشکرِ جرار سے ڈر کر کسی انسانی قبیلہ کے ایک فرد کا اپنے قبیلے کو خطرہ سے خبردار کرنا آخر کونسی ایسی غیر معمولی بات ہے کہ وہ جلیل القدر بادشاہ اس پر خدا سے یہ دعا کرنے لگے۔ البتہ ایک شخص کو اتنی زبردست قوتِ ادراک حاصل ہونا کہ وہ دور سے ایک چیونٹی کی آواز بھی سن لے اور اس کا مطلب سمجھ جائے، ضرور ایسی بات ہے جس سے آدمی کے غرورِ نفس میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو۔ اس صورت میں حضرت سلیمان کی یہ دعا برمحل ہو سکتی ہے۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

— مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے —

اور اُجالا پھیلتا ہی گیا

(از جناب نعیم صدیقی صاحب)

بہت سے لوگ تلوار کے زور سے قطعاتِ ارضی کے عارضی فاتح بنے ہیں، بہت سی بادشاہتیں اور آمریتیں جبر کے زور سے قائم ہوتی رہی ہیں اور کشاکشِ مفاد کے بے شمار فیصلے جنگ کے میدانوں میں طے پاتے رہے ہیں۔ لیکن دنیا کی کوئی بھی انقلابی تحریک ہو اسے اپنی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ رائے عام کے دائرے میں کرنا ہوتا ہے۔ انسانی قلوب جب تک اندر سے کسی دعوت کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوں اور اپنے ذہن و کردار کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے راضی نہ ہو جائیں، محض جبر و تشدد سے حاصل کیے ہوئے علمبردار اس کے لیے مفید نہیں ہو سکتے بلکہ اُلٹا وہ اس کی کامل بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ پس ہر اصولی تحریک کا اصل مزاج تعلیمی ہوتا ہے اور اس کے چلانے والوں میں مربیانہ اور معلمانہ شفقت کی روح کام کر رہی ہوتی ہے۔ اصولی تحریکوں کی نگاہ میں زندگی ایک مدرسہ کی نوعیت رکھتی ہے اور افرادِ انسانی اس مدرسہ کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان طلبہ کی مجموعی فلاح تقاضا کرتی ہے کہ شرارت پسندوں کی اصلاح کے لیے اور ان کے اثر سے شریف اور متوسط عناصر کو محفوظ رکھنے کے لیے تادیب کا عصا بھی کبھی کبھار حرکت میں آتا رہے، لیکن مجموعی فضا بہرحال طلبہ کے حق میں رحمت و شفقت کی فضا ہوتی ہے اور خود تادیب کے عصا کی ہر جنبش میں بھی استاذ کے مربیانہ جذبات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔ سچائی کے کلمے اور نیکی کے نظام کو لے کر اللہ کے جو بندگانِ پاک تاریخ کے مختلف ادوار میں اُٹھتے رہے ہیں انہوں نے چار و ناچار شر و فساد کی سرکوبی کے لیے میدانِ جنگ میں بھی قدم رکھا ہے اور تلوار سے عصائے تادیب کا کام بھی جزوی حد تک لیا ہے، مگر فی الحقیقت ان کا مجموعی کام ہمیشہ مربیانہ و مشفقانہ

روح کے ساتھ ٹھیک تعلیمی انداز سے جاری رہا ہے۔ انہوں نے اصل فیصلہ کُن معرکہ دلیل کی طاقت سے رائے عام کے وسیع تر دائرے ہی میں لڑا ہے۔ ان کا اصول ہر دور میں یہ رہا ہے کہ جسے نئی زندگی حاصل کرنی ہو وہ دلیل سے حاصل کرے اور جسے اس زندگی سے محروم رہ کر اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتارنا پسند ہو وہ دلیل ہی کے ماننے سے مرے۔

حضورؐ کے جنگی اقدامات کو دیکھیں تو معرکۂ بدر سے لے کر فتحِ مکہ تک (فتح خیبر سمیت) کل پانچ بڑے معرکے ہوئے جو اصل حقیقت کے لحاظ سے سارے کے سارے مدافعانہ ہی تھے لیکن ان میں سے اوّل الذکر تین تو اسی صورت میں لڑے گئے جبکہ دشمن نے چڑھائی کر کے مدینہ پر دھاوا بول دے کے دو ہی کارروائیاں مدینہ سے خود حضورؐ نے پیش قدمی کر کے کیں، یعنی ایک فتحِ مکہ (مع جنگِ حنین) کے لیے، اور دوسری فتحِ خیبر کے لیے۔ پس ان دو ہی اقدامات میں فیصلہ ہو گیا۔ مدت کے لحاظ سے دیکھیں تو معرکۂ بدر سے فتحِ مکہ تک کل زمانہ چھ برس کا ہے۔ حضورؐ نے اپنے عظیم تبلیغی و تعلیمی اور تعمیری و اصلاحی کارنامے میں ۲۳ برس کی لمبی مدت کھپائی اور اس میں سے فقط چھ برس ایسے ہیں کہ جن میں تعلیمِ انسانیت کے مختلف کاموں کے ساتھ ساتھ حریفوں کی شمشیرِ جنگ پسند کا مقابلہ بھی مجبوراً کرنا پڑا۔ انتہائی مبالغہ سے اندازہ کریں تو بھی سارے کے سارے معرکوں میں مجموعی طور پر ۱۵ ہزار سے زیادہ افراد حضورؐ کا مقابلہ کرنے نہ آئے ہوں گے۔ ان میں سے صرف ۷۵۹ جانوں کو راستہ سے ہٹانے کے بعد عرب کی کئی لاکھ کی پوری آبادی سنور سدھر جاتی ہے۔ دس برس کے عرصے میں جو تاریخ کی وسعتوں میں بہت ہی محدود دکھائی دیتا ہے، عرب جیسے صحرا کو زندگی کے ایک مدرسۂ فلاح میں بدل دینا اور تمام بکھرے ہوئے قبائل اور انتہائی وحشی و سرپھرے اور جنگجو افراد کو اس میں داخل کر لینا اور پھر ان کو عظیم سچائیوں اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دینے میں کامیاب ہو جانا اور نہ صرف تعلیم دینا بلکہ نوعِ انسانی کے لیے ان کو معلّم و مربی بنا دینا، شاید حضورؐ کی نبوت کا سب سے بڑا حسّی معجزہ ہے۔

پس یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کے خلاف

جاہلیت کی کشمکش کا فیصلہ ہونے میں جنگی معرکوں کا کتنا بھی اثر پڑا ہو، لیکن بہرحال فیصلہ کا اصل میدان رائے عامہ کا میدان تھا ـــــ بلکہ ذرا روحانی زبان میں بات کہیں تو دلوں کا میدان تھا ـــــ عرب کے لاکھوں مرد و زن مفتوح ہوئے تو اسی میدان میں دلیل اور اخلاق کے اسلحہ سے مفتوح ہوئے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہم اپنے مقالہ کی اس آخری فصل میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہر جہتی مخالفت اور مردافگن مزاحمتوں کے نت نئے طوفانوں کے باوجود یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک قلیل مدت میں دس لاکھ مربع میل سرزمین پر پھیلی ہوئی کثیر التعداد اولادِ آدم اسلامی نظامِ حیات کے سایے میں آگئی۔ تو بر تو تاریکیوں کا سینہ چیر کر کیسے خورِ صبح مسکرائی اور اس کی مسکراہٹوں نے ہر پہار حیات پہ ایک پاکیزہ اجالا پھیلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت اگر حق ہو، تحریک اگر انسانی فلاح پر مبنی ہو اور اس کے علمبردار اگر مخلص اور ایثار پیشہ ہوں تو مخالفتیں اور مزاحمتیں ہمیشہ انقلابی قافلہ کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ ہر رکاوٹ ایک سنگِ میل بن جاتی ہے۔ راستے کا ہر کانٹا رہبری کرنے لگتا ہے۔ درد کی ٹیسیں جب فغاں کا روپ اختیار کرتی ہیں تو فغاں ہی بانگِ جرس بن جاتی ہے۔ پیر لہولہان ہوتے ہیں تو خون کی ہر بوند کو شرارۂ عشق ایک چراغِ روشن میں بدل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچائی اگرچہ ایک اقلیت کے ساتھ ابھرتی ہے، لیکن اکثریت کو ضم کر لیتی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ تحریکِ اسلامی نے کن کن قوتوں سے کام لے کر رائے عامہ کے دائرے میں تیزی سے قدم بڑھانے کے راستے بنائے۔

دلیل کی قوت | تحریکِ اسلامی کی سب سے بڑی قوت دلیل کی قوت تھی۔ پیری مریدی کا کوئی نظام ہوتا تو مخاطبوں کی عقلوں کو سُن کرتا، روایتی مذہبیت کا کوئی پیغام ہوتا تو اوہام پسندی کے رجحانات کی آبیاری کرتا، رہبانی تصوف کا کوئی سلسلہ ہوتا تو "چشم بند و گوش بند و لب بہ بند" کا افسوں پڑھتا مگر وہاں تو ایسی ذی شعور روحوں کی مانگ تھی جو خدا پرستی کی بنیادوں پر پورا ایک نظامِ تمدن اٹھا سکیں اور اسے حسن و خوبی سے چلا سکیں۔ اس لیے تحریکِ اسلامی نے اپنی دعوت پیش کی تو سوئی ہوئی عقلوں کو چونکایا، دماغوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا، آنکھیں کھول کر دیکھنے اور کان کھول کر سننے کی تلقین کی، نظامِ کائنات میں تدبر کرنے کی ترغیب دلائی، انفس و آفاق کے احوال کا تجزیہ کرنے کا سبق دیا۔ نت نئے

سوال چھیڑ چھیڑ کر فکروں میں تحریک پیدا کی، ذہنی تقلید کے بندھنوں کو توڑا، فضول روایات و رسوم کے جال پارہ پارہ کیے، آبا پرستی اور ماضی پرستی کے سحر کو باطل کیا۔ اُس نے کالانعام قسم کی مخلوق کے اندر سے سوچنے سمجھنے والا انسان برآمد کرنے کی تدبیر کی، اس نے صمٌ بکمٌ عمیٌ قسم کے افراد کو ٹھوکے لگا لگا کر بے شعوری کی نیند سے نکالا؛ اس نے دماغوں سے زنگ دُور کیا۔ الغرض اس نے جاہلیت کے مسلط کردہ عقلی جمود کو توڑ دیا۔ اس طرح جو جو روحیں جاگتی گئیں اور جن لوگوں کی عقلیں انگڑائیاں لے کر اٹھنے لگیں ان کے سامنے زندگی کی بنیادی سچائیاں رکھیں اور اپنے استدلال کے زور سے یکے بعد دیگرے ان کو متاثر کر کے چھوڑا۔

تحریکِ اسلامی نے خدائے واحد کو خالق، مالک، رازق، حاکم اور ہادی کی حیثیت سے پیش کیا تو اس زور استدلال سے پیش کیا کہ جوابی اوہام کے اسلحہ کند ہو کر رہ گئے۔ اُس نے انسانی قوت مشاہدہ کو اکسا کر دعوت دی کہ زمین و آسمان کی نیرنگیوں پر نگاہ ڈالو، چاند تاروں کی گردش پر غور کرو، موسموں کے چڑھتے کا گھماؤ دیکھو، ہواؤں اور بارشوں کے نظام میں کاوش کرو، نباتات کی روئیدگی و بالیدگی کے مناظر سے سبق لو، حیوانات کی نشو و نما اور ان کے تناسل میں دماغ کھپاؤ، انسانی گروہوں کی رنگارنگی اور تمدنوں کے مدوجزر کا مطالعہ کرو، اپنے نفوس و اذہان کی گہرائیوں میں جھانکو! — تم دیکھو گے کہ ہر طرف اٹل قوانین اپنا کام کر رہے ہیں، ہر دائرۂ وجود میں ایک نظم کی کارفرمائی ہے، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعات و حوادث کا رُخ کسی غایت کی طرف ہے، گوناگوں اضداد باہم دگر تعاون کر رہے ہیں، پورے کارخانۂ ہستی میں ایک توافق کارفرما ہے، کثرت وحدت کے رشتے میں بندھی ہے، پھر ہر شے میں ارتقا ہے، ہر چیز بہتری کی طرف جا رہی ہے، ہر علت کسی اہم تر نتیجے کو پیدا کر رہی ہے اور پھر ہر نتیجہ خود آگے کے لیے ایک علت بن رہا ہے۔ یہ قانون، یہ نظم، یہ توافق، یہ تعاون، یہ وحدت، یہ ارتقا آپ سے آپ بطور ایک اتفاقی حادثے کے نمودار نہیں ہوا۔ چیزیں اپنے آپ کو خود تجویز نہیں کرتیں، اپنا نقشہ خود نہیں بناتیں، بے شعور اور بے جان مادہ اور بچے موجودات کی تخلیق آپ سے آپ نہیں کرتا، عناصر باہمی مشورے سے توافق نہیں کرتے، بلکہ

ایک بالاتر ہستی ــــ فعّال و مختار اور حکیم و خبیر ہستی ــــ ایک ناظم، ایک ڈائرکٹر، ایک حکمراں اور ایک قانون ساز کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ تمام قوات و عناصر اسی کی تسبیح کہتے ہیں، تمام موجودات اسی کے حضور میں سجدہ ریز ہیں، تمام مخلوق اس کے طبعی دین کی پابند ہے۔ عظیم سورجوں سے لے کر ننھے سالمون تک ہر شے اس کی بارگاہ میں مسلم کی حیثیت سے سرِ انقیاد خم کیے ہوئے ہے۔ پھر اسلامی تحریک نے بتایا کہ اگر اتنے بڑے کارخانۂ وجود کے اوپر ایک سے زیادہ مالک اور منتظم ہوتے تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا اور یہ یک رنگی اور یک آہنگی کسی طرح قائم نہ رہتی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔ گویا کتابِ کائنات کا ہر ورق خدا کی ہستی ہی پر نہیں بلکہ اس کی توحید پر اور اس کی مختلف صفات پر محکم دلائل سے بھرا پڑا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے دلیل کے زور سے واضح کیا کہ یہ کائنات جو پوری کی پوری خدا کے دین اور قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور جس کا ہر ذرّہ اس کے سامنے مسلم بن کر حاضر ہے، اس میں کسی مخلوق کے لیے بندگی و طاعت اور اسلام و انقیاد کا رویّہ اختیار کیے بغیر کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم خدا کے مسلم ہو گے تو ساری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاؤ گے اور تمہارا نظامِ تمدن ویسے ہی امن و توافق کا مظہر بن جائے گا، جیسا مادہ کی ساری نگری میں کارفرما ہے اور تم اگر خدا سے بغاوت اور کفر کرو گے تو نظامِ کائنات سے تمہارا نظامِ تمدن بے ربط ہو جائے گا اور اس میں وہ توازن و توافق نہیں رہے گا جو زمین و آسمان میں کارفرما ہے اور جس کی وجہ سے موجودات سلامتی سے بہرہ مند ہو کر ارتقا کر رہے ہیں۔ اس کائنات میں انسان کے لیے بھی فلاح کی واحد راہ یہی ہے کہ وہ خدا کے دین اور خدا کے قانون کا پابند ہو کے رہے۔ تم جو خدا کے پیدا کیے سے پیدا ہوتے ہو، اس کے رزق پر پلتے ہو، اس کی قوتوں کے بل پر زندگی گزارتے ہو، اس کی زمین پر رہتے اور اس کے آسمان کے نیچے چلتے پھرتے ہو اور ہاں تم کہ جن کے بدن کا عضو عضو اور جن کے اعضاء کا ذرہ ذرہ مسلم بن کر خدائی قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ تمہارے لیے زندگی کی کوئی سیدھی راہ ہے تو خدا کی بندگی ہی کی راہ ہے۔ تمہاری فطرت کا خمیر اسی بندگی کے عہد سے اٹھایا گیا ہے اور تمہارے ضمیروں میں احساس

عبودیت پیوست ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اُسی زورِ استدلال سے یہ حقیقت بھی اجاگر کی کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی احتیاج ہر ہر ذرّے کو ہے۔ وہی عناصر کی تقدیریں مقرر کرنے والا ہے، وہی اجرام فلکی کے مدار اور ان کی رفتاریں طے کرتا ہے، وہی اشیاء کو مختلف خواص دیتا ہے، وہی ہر ہر قوت کو اس کے خاص فرائض میں لگاتا ہے اور وہی ہر مخلوق کے لیے راہِ عمل معین کرتا ہے۔ دوسرے موجودات کی طرح انسان بھی اس کی ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جیسے وہ روشنی، ہوا اور پانی کا محتاج ہے۔ خدا نے اپنی ہدایت سے مخلوق کو بہرہ مند کرنے کے لیے وحی کا نظام مقرر کیا ہے۔ بے جان عناصر کے لیے طبعی جبریت، نباتات کے لیے قوتِ نمو، حیوانات کے لیے جبلت وحی کا ذریعہ ہے لیکن انسان چونکہ شعور سے بہرہ مند ہے اس لیے اس کے لیے وحی کی وہ تکمیلی صورت مقرر کی گئی ہے جس کے تحت اس کے شعور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اپنی اصولی دعوت کے اس جزء کو بھی دلیل ہی کے زور سے قابلِ قبول بنایا کہ جب اس کائنات میں علت و معلول اور سبب و نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہے تو انسان کے اخلاقی اعمال کو بھی اس جامع قانون کے تحت کسی تکمیلی نتیجہ تک پہنچنا چاہیے۔ اس نے قانونِ مکافات کو تاریخ میں دکھا کر ثابت کیا کہ اس قانون کے احاطے میں انسان کی تمدنی سرگرمیوں کو بھی آنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی دکھایا کہ انسان کی اس محدود امتحانی زندگی میں محدود قانونِ مکافات کے تحت پورے کے پورے نتائجِ اعمال سامنے نہیں آتے بلکہ بسا اوقات ایک سلسلۂ اعمال ہی کی تکمیل نہیں ہو پاتی، نیز اس سے بھی بڑھ کر بہت سی صورتوں میں بالکل اُلٹے نتائج سے آدمی کو دوچار ہونا پڑتا ہے لہٰذا اس خدائی نظام سے توقع کرنی چاہیے کہ ارضی زندگی کے بعد کسی نئے دورِ حیات میں انسانی اعمال کے نتائج کو بھرپور طریق سے ظاہر کرنا ہے۔ خدائی عدل جو ہر طرف کارفرما ہے اس کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ جو جیسا کرے ویسا بھرے۔ اس طرح اس نے حیات بعد الموت اور محاسبۂ آخرت اور جزا و سزا کا تصور دیا۔

پھر ان ساری بنیادی سچائیوں کو ثابت کرنے کے لیے اس نے پچھلی پوری انسانی تاریخ پیش کر دی۔ ایک ایک قوم کی داستان کو لیا اور دکھایا کہ جن انسانی گروہوں نے زندگی کا نظام ان حقائق پر اٹھایا انہوں نے فلاح پائی اور جنہوں نے ان سے روگردانی کی وہ خوار و رسوا ہو کر ملیامیٹ ہو گئے۔ جن افراد نے ان کو قبول کیا ان کے دل و دماغ روشن ہو گئے اور ان کے کردار جگمگا اٹھے اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی وہ پستیوں میں گرتے چلے گئے۔ دکھایا کہ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کی دعوت ہر دورِ تاریخ میں ہر قوم کے سامنے ایک ہی طرز کے لوگوں نے بار بار پیش کی اور ان کو غالب کرنے کے لیے بے لوث جذبۂ اخلاص کے ساتھ جان و مال کی ساری متاع نچھاور کر دکھائی۔

اسلامی تحریک کی یہ اساسی دعوت اپنے پورے استدلالات کے ساتھ قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بڑے حُسنِ تکرار سے پیش کیا گیا، اسے دلرُبا تصریفِ آیات کے ساتھ لایا گیا، اس کے لیے بہترین ادبی زبان استعمال کی گئی، اس میں جذباتِ لطیف کا رس گھول دیا گیا، مخالفانہ اعتراضات کو ساتھ کے ساتھ صاف کیا گیا، منکروں اور حریفوں کی نکتہ آفرینیوں اور طنز و استہزا کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا گیا۔ پھر کہیں عبرت دلائی، کہیں تنبیہ کی، کہیں شرم دلائی، کہیں چیلنج دیا، کہیں نرمی اور لطافت سے دلوں کو پگھلایا، کہیں استفہام کا انداز اختیار کیا، کہیں استعجاب کا رنگ بھرا، غرضیکہ مختلف اسالیب سے انسانی ذہن کو اس طرح گھیرا کہ اربابِ شعور کے لیے کوئی راہِ فرار کھلی نہ رہنے دی

اگر بازی تلوار کے زور سے جیتی جانے کی ہوتی تو آخر استدلال کے اتنے اہتمام کی ضرورت ہی کیا تھی جو قرآن کے دو تہائی بلکہ زائد حصے میں پھیلا ہوا ہے۔

درحقیقت اسلامی تحریک کی بے پناہ قوتِ استدلال نے اپنے مخاطبوں کو بے دم کر دیا۔ اور ان میں سے اہلِ سعادت نے قبولِ حق کے لیے دلوں کے دروازے کھول دیئے اور اہلِ زیغ مجبور ہوئے کہ دلیل کی بازی ختم کر کے تشدد کے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئیں۔ جو بھی دعوت و تحریک اپنے مخاطبوں کو اس مرحلے پر پہنچا دیتی ہے وہ آخرکار میدان مار لے جاتی ہے۔

خیر خواہانہ اپیل | دلیل مجرد دلیل ہی نہ تھی بلکہ دلیل کے ساتھ دلوں کو پگھلا کر موم کر دینے والی اُمور

بھاگنے والوں کو قریب کھینچنے والی، روحوں کے بند دروازوں پر دستک دے کر ان کو کھلوا لینے والی اپیل بھی شامل تھی۔ دعوتِ حق کی اپیل نے چٹانوں میں احساس اُبھار دیا، لکڑی کے کندوں میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیں اور اکثر دشمنوں کی آنکھوں کو اشک آلود کر دیا۔ اسلامی تحریک کے ساز سے ایسے ایسے روح پرور نغمات اٹھے کہ دلوں میں حیاتِ نَو کی رَو دوڑا گئے۔ جاؤ، قرآن کھول کے دیکھو کہ کس طرح اس کے ایک ایک جملے میں شعور کے نور کے ساتھ جذبوں کی گرمی گھُلی ہوئی ہے۔ یہ دراصل آتشہ صہبائے طہور تھی کہ جس نے بڑے بڑے سنگدلوں کو مسخر کر لیا اور جس نے حق کے دشمنوں کو حق کا خادم بنا دیا۔ پھر اس کا ادبی زور ایسا سحر آفریں تھا کہ اس نے چمنِ فصاحت کی بلبلوں کو ساکت، وقت کی بزمِ سخن میں نغمہ آفریں شعراء کو گنگ کر دیا۔ اُس نے ایسی عربیٔ مبین میں کلام کیا کہ سارا عرب ویسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہ گیا۔ ہم یہاں دعوتِ حق کے نغمہ کے چند بول پیش کر رہے ہیں:۔

"اِن سے کہو (اے پیغمبر! میری طرف سے) کہ اے میرے بندو، جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہو، اللہ کی رحمت سے اپنی آس نہ توڑو۔ یقیناً (تم رجوع کرنے والے بنو تو) خدا سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے اور یقیناً وہ درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ اور تم اپنے رب کی طرف جھکو اور اس کے حضور میں سرِ تسلیم خم کر دو، قبل اس کے کہ تم کو عذاب آ گھیرے اور پھر تمہیں کوئی مدد نہ مل سکے! اور پیروی کرو اُس بہترین نوشتۂ ہدایت کی جو تمہارے رب کی بارگاہ سے تمہاری جانب بھیجا گیا ہے، قبل اس کے کہ تمہیں عذاب اچانک آ پکڑے جبکہ تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ پھر اس وقت کوئی جان یہ کہتی رہ جائے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے حق میں دکھائی اور میں دحقیقت کی ہنسی اڑاتا رہا۔ یا وہ مایوس ہو کر کہے کہ اگر اللہ مجھے راستہ سمجھاتا تو میں سنبھل کر چلنے والوں میں شامل ہوتا۔ یا جب وہ عذاب کو دیکھے تو یوں کہے کہ اگر ایک موقع اور ملے تو میں احسان کیش لوگوں میں جا ملوں۔"

(الزمر- ۵۳ تا ۵۸)

اس ایک ٹکڑے میں بڑے ایجاز سے وہ ساری بنیادی سچائیاں سمو دی ہوئی ہیں جن کی آئینہ دار محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی۔ پھر اس میں عقلی استدلال بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ دل ہلا دینے والا جذباتی اپیل ہے۔ اس میں بشارت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ قرآن اس طرح کی زنگارنگ پکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے انسانی پتلوں کے بس میں نہ تھا کہ ایسے انقلاب آفریں کلام کی موجوں کے سامنے کھڑے رہ سکتے جبکہ اس کے ریلے مسلسل چلے آرہے تھے ۔۔۔ ہر صبح، ہر شام، ہر آن!! ۔۔۔ تیئیس سال تک متواتر یہ سیلِ معنی اُمڈتا رہا تو آخر کیسے تصور میں آسکتا ہے کہ نور اور حرارت کی ان روؤں کی زد پر آنے والے آدم زاد اپنی جگہوں پر جوں کے توں جامد رہ سکتے۔ دو اور الہام پارے جن میں عمومی خطاب ہے ملاحظہ ہوں :-

"اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو متنبہ نہ کر دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی ہے راہِ راست اور اس کے باوجود اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو بہکالے گیا۔ پھر کیا تم لوگ سوجھ بوجھ سے کام نہ لے سکتے تھے؟" (یٰس ۶۰ تا ۶۲)

"کہہ دو (اے پیغمبر!) کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق تم تک آچکا ہے۔ اب جو کوئی بھی راہ یاب ہو تو اس کا راہ یاب ہونا اس کی اپنی جان کے لیے (سودمند) ہے اور جو کوئی بھٹکے تو اس کا بھٹکنا خود اسی کے لیے (موجب خسران) ہے۔ اور میں تم پر مختار نہیں ہوں۔" (یونس ۔ ۱۰۸)

وہ لوگ جنہوں نے مخالفت کے محاذ کھولے ان کے بھی بہترین احساسات کو پکارا گیا اور زیادہ سے زیادہ موثر اور دلگداز اسلوب سے ان کی اساسی فطرت کو اپیل کیا گیا۔ مشرکین مکہ ہوں یا اہلِ کتاب، ہر گروہ کے بہترین عناصر کو بہترین اسلوب سے خطاب کیا اور ان کے بہترین جذبات کو حرکت میں لانے کی کوشش کی حتیٰ کہ منافقین کو بھی اصلاح کی دعوت دی۔ اس سلسلے کی مثالیں بھی الگ الگ پیش کی جاتی ہیں :-

——مشرکین سے خطاب :-

"اللہ نے ایک بستی کی مثال دی ہے جو امن چین سے دن گذار رہی تھی اور اس کی روزی ہر چہار جانب سے با فراط چلی آ رہی تھی، پھر اس (کے باشندوں) نے خدا کے احسانوں کی ناشکری کی، سو اللہ نے ان کے کرتوتوں کے بدلے میں انہیں بھوک اور خوف (کی حالت) کا لباس پہنا کر مزہ چکھایا۔ اور ان کے درمیان خود انہیں میں سے پیغمبر مبعوث ہو چکا تھا، پھر انہوں نے اسے جھٹلا دیا، پس ان کو عذاب نے آ پکڑا ——اور وہ تھے ہی ظالم!"

——اہلِ کتاب سے خطاب :

"اے اہلِ کتاب! ہمارا رسول تمہارے پاس آ چکا جو کتابِ الٰہی کی ان بہت سی حقیقتوں کو تمہارے سامنے نتھار کر لا رہا ہے جنہیں تم چھپاتے ہو، اور وہ بہت ساری چیزوں سے درگزر بھی کرتا ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آ چکی اور واضح کتاب پہنچ چکی جس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو سلامتی کی راہ پر لاتا ہے جو اس کی مرضیات کے پیچھے چلیں اور انہیں تاریکیوں سے نکال نکال کر اپنے حکمِ خاص کے مطابق اجالے میں لاتا ہے اور انہیں راہِ راست کی طرف رہنمائی دیتا ہے۔ (المائدہ - ۱۶)

"کہو! اے پیغمبر! کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق کے مبالغہ سے کام نہ لو اور (اپنے ہاں کے) ایسے لوگوں کے نفسانی رجحانات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے سے گمراہ ہیں اور جنہوں نے بہتوں کو بہکا دیا ہے اور جو سیدھی راہ سے دور جا پڑے ہیں۔"

(المائدہ —— ۷۷)

"اے اہلِ کتاب! رسولوں کے سلسلۂ بعثت میں ایک لمبے وقفے کے بعد ہمارا رسولؐ تمہارے پاس آ چکا جو حقیقتوں کو تمہارے سامنے نتھار کر لا رہا ہے۔ (ممکن ہے) کہیں تم (بہ طورِ عذر) کہو کہ ہم تک تو کوئی بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا آیا ہی نہ تھا۔ سو اب بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا تمہاری طرف آ چکا۔" (المائدہ ۱۹)

"اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے لیے یہ فیصلہ دے دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت بڑی طرح سرکشی دکھاؤ گے۔ سو (اے بنی اسرائیل)، جب پہلے وعدہ کا موقع آیا تو ہم نے تمہارے اوپر اپنے سخت جنگجو بندوں کو مسلط کر دیا، پھر وہ شہروں میں پھیل گئے۔ اور وہ وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا۔ پھر ہم نے ان کے مقابلے میں تمہیں ایک موقع دیا اور اموال و اولاد سے تمہیں تقویت دی اور تمہاری تعداد بڑھا دی (اور تمہیں پھر مہلت دی کہ) اگر تم نے بھلائی اختیار کی تو اپنی ہی جانوں کا بھلا کیا اور اگر برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی حق میں کی! پھر جب دوسرے وعدہ کا موقع آیا کہ وہ لوگ تمہارے چہروں کو (دکھ اور ذلت کی سیاہی سے) کلو نسا دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اس طرح گھسیں جیسے وہ پہلے گھسے تھے اور جہاں وہ غلبہ پائیں وہاں تباہی پھیلا دیں۔ (تو تم نے پورا پورا مزہ چکھ لیا)!— اب (جبکہ دعوتِ محمدیؐ کے نمودار ہونے سے تمہارے سامنے ایک فیصلہ کن موقع اور پیدا ہوا ہے) تمہارا رب چاہتا ہے کہ تم پر رحم کرے۔ لیکن اگر تم پھر وہی کچھ کرو گے تو ہم بھی ویسا ہی مزہ چکھائیں گے۔ اور (آخرت میں) ہم نے جہنم کو نافرمانوں کے لیے ٹھکانا بنایا ہے"

(بنی اسرائیل۔ ۴ تا ۸)

"کہو کہ اے اہلِ کتاب! اس کلمہ کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر (اور مشترک) ہے — یہ کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی شے کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم لوگ اللہ کو چھوڑ کر باہم کر ایک دوسرے کو رب بنا لیں" (آل عمران ۔ ۶۴)

— عیسائیوں سے خطاب!

"اور تم (یہود کے مقابلے میں)، اُن لوگوں کو مسلمانوں کی محبت میں قریب تر پاتے ہو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں میں علماء اور

درویش ہیں اور اس وجہ سے کہ یہ لوگ تکبر میں مبتلا نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ جب اُس کلام کو سُنتے ہیں جو رسولؐ پر اُترا ہے تو ان کے حق کو پہچاننے کے باعث تم اُن کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، پس ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے"

(المائدہ)

——منافقین سے خطاب :-

"کیا یہ (منافق) لوگ سوچتے نہیں کہ یہ ہر سال دو ایک بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی تو یہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ آیا کوئی تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر اٹھ کے چلے جاتے ہیں۔ ان کے دلوں کو خدا نے اس لیے پھیر دیا ہے کہ یہ لوگ سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ دیکھو! تمہارے اندر سے رسول تمہارے پاس آچکا ہے، اس کے لیے بارِ خاطر ہے ہر وہ چیز جو تمہیں تکلیف دے، وہ تمہارا مشتاق ہے اور وہ اہلِ ایمان کے لیے شفیق اور مہربان ہے۔" (یونس-۱۲۶ تا ۱۲۸)

قرآن دلوں کو پگھلا دینے والے ایسے ایسے بولوں سے بھرا پڑا ہے۔ روحوں میں پیوست ہو جانے والے جملے، ضمیروں میں تحریک پیدا کر دینے والے موتیوں جیسے الفاظ، احساسات کے تاروں کو چھیڑ دینے والے ادبی اسالیب! —— کتنی بڑی طاقت ہے قرآن اور کتنی ہنگامہ خیز رہی ہوگی دعوتِ حق! حقیقت کی یہ شعاعیں جب پے درپے برستی ہونگی تو اوسط درجے کے انسانوں کے لیے کیسے ممکن رہا ہوگا کہ وہ رفتار و کردار کی تاریکیوں کو سینے میں آراستہ کیے رکھیں۔ دلیل کی طاقت کے ساتھ جب اپیل کی طاقت آملتی ہے تو یہ دو دھاری تلوار پتھروں کو بھی کاٹ جاتی ہے۔ پھر جہاں قرآن کی بارانِ کلام کی پھواریں متواتر پڑ رہی تھیں، وہاں صاحب نبوت کا تکلم بھی درسوں، خطبوں، تقریروں اور گفتگوؤں میں قرآن نور کی لہریں اٹھا رہا تھا۔ زمانے نے اُس بحرِ مواج کے جو موتی محفوظ رکھے ہیں، ذرا آج ان کو جانچو

چھوٹے چھوٹے بول، تھوڑے لفظوں میں زیادہ معنی، ادبیت و خطابت کا زور، بات میں روح اخلاص گھلی ہوئی، گفتگو حالات پر منطبق ـــ کسی دوسری شخصیت کا سمندر ایسے موتی پھر پیدا نہ کر سکا۔ پھر اسلامی تحریک کے شعراء اور ادیب اور خطیب تھے کہ جنہوں نے نئے فنی معیارات اور انقلابی اسالیب کے ساتھ جب ساز نطق پر اسلام کے کلمۂ انقلاب کا زخمہ چلایا تو ان کی ہر موج آہنگ نے ریت کے ذرّوں میں بھی دھڑکتے ہوئے دل پیدا کر دیئے ہونگے۔ آج بھی اس دور کے ذخیرۂ سخن کو اٹھا کر دیکھو تو حسان بن ثابتؓ اور کعب بن مالکؓ کا حسین تخیل ان کے مخلصانہ جذبوں کے پر لگا کر عجیب عقابی شان سے اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نغمے جب روزمرہ واقعات سے ہم آہنگ اور کشمکش کے ماحول سے مربوط ہو کر نمودار ہوتے ہونگے تو آخر انسانی دلوں پر کوئی تو کیفیت گزرتی ہوگی۔ مدعا یہ کہ اصل طاقت قول حق کی تھی جس کے سامنے ممکن نہ تھا کہ باطل میدان میں جما رہ سکے۔ ان الباطل کان زھوقا!

(باقی)

رسائل و مسائل

۱۔ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط
۲۔ حکمتِ عملی اور اختیارِ اہون البلیّتین کی تشریح

سوال۔ حدیث الائمۃ من قریش کے متعلق آپ نے اپنے مضامین میں جو کچھ لکھا ہے اور اس پر بعض حلقوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں، ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر حسبِ ذیل امور تنقیح طلب محسوس ہوتے ہیں جن پر خالص علمی حیثیت سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے:

۱۔ کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہ امر ہے نہ خبر نہ وصیت بلکہ یہ ایک قضیہ کا فیصلہ تھا جو خلافت کے بارے میں قریش اور انصار کے درمیان حضور کی زندگی ہی میں ذہنوں کے اندر موجود تھا اور حضورؐ کو اندیشہ تھا کہ آپ کے بعد یہ ایک نزاع کی صورت اختیار کر لیگا، اس لیے آپ نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ فرما دیا کہ آپ کے بعد قریش اور انصار میں سے قریش ہی خلافت کے حق دار ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ محض ایک وقتی فیصلہ تھا جس سے مقصود حضور کے فوراً بعد رونما ہونے والی نزاع کو رفع کرنا تھا اور بس۔ کیا حدیث مذکور کی یہ تعبیر درست ہے؟

۲۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے سے مساوات کا اصول نہیں ٹوٹتا کیونکہ اسلام میں مساوات کا اصول مطلق نہیں ہے بلکہ اہلیت و قابلیت کی شرط سے مقید ہے اور یہ شرط اصولِ مساوات کی ضد نہیں ہے۔ مساوات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص بلالحاظِ اہلیت و صلاحیت ہر منصب کا مستحق ہو۔ اب چونکہ

خلافت کے لیے اہلیت کی دوسری صفات کے ساتھ ساتھ سیاسی زور و اثر بھی ایک ضروری صفت ہے، اور اُس وقت یہ سیاسی زور و اثر قریش ہی کو حاصل تھا، اس لیے انصار کے مقابلے میں ان کے استحقاقِ خلافت کو جو ترجیح دی گئی وہ اہلیت ہی کی بنا پر دی گئی۔ اس استدلال کی بنا پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس فیصلے سے اصولِ مساوات نہیں ٹوٹتا۔ کیا یہ استدلال صحیح ہے؟

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کبھی اس حدیث کو امر قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے خبر ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے چراغِ راہ کے اسلامی قانون نمبر (جلد ا قل صفحہ ۱۸۰) سے آپ کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں آپ نے اس حدیث کو محض ایک پیشین گوئی قرار دیا تھا اور اس کے حکم ہونے سے انکار کیا تھا۔ حالانکہ اب آپ اسے ایک حکم قرار دیتے ہیں۔ کیا اس سے یہ شبہ کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی کہ یا تو آپ اس مسئلے کو سمجھے نہیں ہیں یا پھر آپ کبھی اپنے مطلب کے مطابق اس کا ایک مفہوم بناتے ہیں اور کبھی دوسرا؟

۴۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی وضاحت طلب ہے کہ وہ اصول کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے آپ مستنبط کرتے ہیں اور اس کا انطباق آپ کے نزدیک کن امور پر کس طرح ہوگا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اگر آپ امورِ ذیل کی وضاحت بھی کردیں تو مناسب ہوگا:

(الف) حکمتِ عملی اور قاعدۂ اہون البلیتین سے آپ کی مراد کیا ہے؟

(ب) کیا یہ قاعدہ دو ناگزیر برائیوں کی طرح دو ناگزیر بھلائیوں اور دو واجب الاطاعت احکام کے درمیان بھی استعمال ہو سکتا ہے؟

(ج) کیا آپ چاہتے ہیں کہ اب اقامتِ دین کی جدوجہد انبیاء کے طریقِ عزیمت کو چھوڑ کر صرف رخصتوں اور حیلوں اور مصلحت پرستیوں ہی کے بل پر چلے

اور سیاسی اغراض کے لیے دین کے جس اصول میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہو اسے حدودِ شریعت کا لحاظ کیے بغیر دینی حکمت و مصلحت کے نام سے کر ڈالا جائے۔

(د) کیا آپ تحریکِ اقامتِ دین کے قائد کی حیثیت سے خود اپنے لیے اس اختیار کے مدعی ہیں کہ حکمتِ عملی یا عملی سیاست یا اقامتِ دین کے مصالح کے تحت دین کے احکام و قوانین میں سے کسی کو ترک اور کسی کو اختیار کریں، کسی کو جائز اور کسی کو ناجائز ٹھہرائیں اور کسی کو مقدم اور کسی کو مؤخر کر دیں؟

(ہ) اگر یہ ڈھیلا ڈھالا اصول لوگوں کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے کہ تم دین کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر جس بات کو چاہو اختیار اور جسے چاہو ترک کر سکتے ہو تو کیا اس سے یہ خطرہ نہیں کہ دین کے معاملے میں بالکل امان ہی اٹھ جائے گی اور جس کے ہاتھ میں یہ نسخہ پکڑا دیا جائے گا وہ پورے دین کا تیا پانچا کر کے رکھ دیگا؟

(و) یہ امر تو مسلّم ہے کہ شارع کو خود اپنے احکام میں تغیر و تبدل کرنے اور تقدیم و تاخیر کرنے یا ان میں رخصتیں دینے اور استثناء نکالنے کے اختیارات حاصل ہیں، مگر کیا شارع کے ان تصرفات پر قیاس کر کے اور ان سے کچھ اصول مستنبط کر کے دوسرے بھی انہیں نئے پیش آمدہ مسائل پر چسپاں کرنے کا اختیار رکھتے ہیں؟ اور یہ اختیار آخر کس کو حاصل ہے؟

جواب۔ آپ کے سوالات کی ترتیب توڑ کر تیسرے سوال کا جواب میں پہلے دونگا تا کہ ایک ضمنی بحث بیچ میں آ کر اصل مسائل سے توجہ نہ ہٹا سکے۔ چراغِ راہ کے اسلامی قانون نمبر سے میری جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ دراصل آج سے ۲۰ سال پہلے اگست ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں ایک مستشرق کے مضمون "اسلامی قانون اور نظامِ معاشرت" پر مختصر نوٹ کی حیثیت سے لکھی گئی تھی۔ اُس وقت تک مجھے اس مسئلے کی تحقیق کا موقع نہ ملا تھا اور میں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحقیق پر اعتماد کر کے ایک رائے ظاہر کر دی تھی[1] لیکن بعد میں جب میں نے خود تحقیق کی تو مجھے

[1] اس کی تاریخ یہ ہے کہ تحریکِ خلافت کے آغاز میں یورپ کے مستشرقین نے یہ سوال اٹھایا تھا اور ہندوستان

وہ رائے غلط محسوس ہوئی اور میں نے اپریل سنہ ۴۶ء کے ترجمان القرآن میں اس کے خلاف اپنی اُس رائے کا اظہار کیا جسے آپ "خلافت کے لیے قرشیت کی شرط" کے زیرِ عنوان رسائل و مسائل جلد اول میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں علمی مسائل میں رائے بدلنا کوئی نیا اور نرالا واقعہ نہیں ہے۔ اس کو اگر کسی بُرے معنی پر کوئی شخص محمول کرنا چاہے تو اسے اپنے فعل کا اختیار ہے میری تبدیلی رائے کے وجوہ آگے آپ خود دیکھ لینگے۔

اب اصل مسائل کی طرف آئیے۔ آپ نے اپنے سوال ۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جو توجیہ نقل کی ہے اس میں پہلی ناقابلِ فہم بات تو یہ ہے کہ کسی معاملہ میں ایک حکم دینے اور کسی قضیے کا فیصلہ کر دینے میں آخر وہ کیا باریک فرق ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ امر نہ تھا بلکہ ایک قضیے کا فیصلہ تھا۔ پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ حضور نے خواہ انصار پر قریش کے حقِ خلافت کو ترجیح دی ہو یا تمام عرب و عجم پر، اس سے نفس مسئلۂ زیرِ بحث پر آخر کیا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر کے اگر آپ بجائے خود اس توجیہ کا علمی جائزہ لیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ محض ایک خانہ ساز توجیہ ہے جس کی پشت پر زعم اور ادّعاء کے سوا کوئی دلیل و ثبوت نہیں ہے۔ کیا فی الواقع حدیث، سیرت اور تاریخ کے پورے ذخیرے میں کوئی شہادت اس امر کی ملتی ہے کہ حضورؐ کے حینِ حیات انصار اور مہاجرین کے درمیان خلافت کے متعلق کوئی قضیہ پایا جاتا تھا؟ صحابۂ کرام کا حال تو یہ تھا کہ وہ حضورؐ کی وفات کا تصور بھی برداشت نہ کرتے تھے، کجا کہ یہ جان نثارانِ نبی آپ کے جیتے جی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کر یہ سوچتے ہوں کہ آپ کی جانشینی ان میں سے کسے حاصل ہو۔

ء- کی انگریزی حکومت نے بعض مولوی صاحبان سے اس کی تائید کرائی تھی کہ سلاطینِ عثمانی کی تو خلافت ہی باطل ہے کیونکہ وہ قرشی النسب نہیں ہیں اور شریعت کی رُو سے خلیفہ ہونے کے لیے قرشی ہونا شرط ہے اس پر مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے سنہ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ خلافت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ایک مفصل خطبہ ارشاد فرمایا تھا جو بعد میں "مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے بڑے زوردار طریقہ سے یہ بیان کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد الائمۃ من قریش سرے سے حکم تھا ہی نہیں بلکہ وہ محض ایک خبر تھی جو حضورؐ نے آنے والے حالات کے متعلق دی تھی۔ مولانا کی اسی تحقیق کا اثر میرے ذہن پر تھا جس کے تحت میں نے مذکورۂ بالا نوٹ میں اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

اور یہ سوچ اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ انصار و مہاجرین کے درمیان ایک قضیے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ یہ ایک سراسر بے اصل بات ہے جو تاریخی ثبوت کے ادنیٰ شائبے کے بغیر گھر بیٹھے تصنیف کر ڈالی گئی ہے۔ پھر اس پر اس سے بھی زیادہ ایک ہوائی مفروضے کی عمارت یہ تعمیر کی گئی ہے کہ حضورؐ نے قریش کے استحقاقِ خلافت کے بارے میں جو کچھ بھی فرمایا اس سے مقصود دراصل اسی قضیے کا فیصلہ کرنا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کسی شخص کو حضورؐ کے اس منشا کا علم کس ذریعہ سے حاصل ہو گیا؟ کیا حضورؐ نے خود اس کی صراحت فرمائی تھی؟ یا آپ کے کلام یا اس کے متعلقات میں کوئی قرینہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے یہ منشا مترشح ہوتا ہو؟ یا حضورؐ کے بعد ائمۂ اہلِ علم میں سے کسی نے آپ کا یہ منشا سمجھا؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو آخر اس جسارت کی کوئی حد بھی ہے کہ آدمی جس چیز کو چاہے بلا دلیل و ثبوت شارع کا منشا قرار دے بیٹھے۔

احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایک ہی قول اس مسئلے کے متعلق منقول نہیں ہے بلکہ حضورؐ نے متعدد مواقع پر اسے مختلف طریقوں سے ارشاد فرمایا ہے۔ ان ارشادات کو خود دیکھ لیجیے اور بتائیے کہ ان میں کہاں اس منشا کا کوئی سراغ ملتا ہے۔

بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھٰذا الامر فی قریش لا یعادیھم احد الا کبہ اللہ فی النار علی وجھہ ما اقاموا الدین "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ یہ کام قریش میں رہے گا، جو شخص بھی اس میں ان کی مخالفت کرے گا اسے اللہ اوندھے منہ آگ میں پھینک دیگا، جب تک کہ وہ دین کو قائم کرتے رہیں۔"

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضورؐ کی ایک تقریر نقل کرتے ہیں جو آپ نے قریش کو خطاب کر کے ارشاد فرمائی: اما بعد یا معشر قریش فانکم اھل ھٰذا الامر ما لم تعصوا اللہ فاذا عصیتموہ بعث الیکم من یلحاکم کما یلحی ھٰذا القضیب۔ "اما بعد، اے گروہِ قریش تم اس کام کے اہل ہو جب تک کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو۔ پھر اگر نافرمانی کرو گے تو اللہ تم پر کسی کو بھیجے گا جو تمہاری کھال اس طرح اتار دیگا جیسے اِس ٹہنی کی چھال اتار دی جاتی ہے۔"

مُسند احمد اور مسند ابو داؤد طیالسی میں حضرت ابو برزہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا
الائمۃ من قریش ما عملوا بثلث، ما حکموا فعدلوا واسترحموا فرحموا وعاھدوا
فوفوا فمن لم یفعل ذالک منھم فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین "ائمہ
قریش میں سے ہوں گے جب تک کہ وہ تین باتوں پر عمل کرتے رہیں۔ حکم کریں تو عدل کے ساتھ کریں جب
ان سے رحم طلب کیا جائے تو رحم کریں۔ جب عہد کریں تو وفا کریں۔ پھر جو ان میں سے ایسا نہ کرے
اس پر خدا اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت" قریب قریب یہی مضمون اس سے ملتے جلتے الفاظ
میں ان دونوں ائمۂ حدیث نے حضرت انس بن مالکؓ سے بھی نقل کیا ہے۔

امام شافعیؒ اور بیہقیؒ نے عطاء کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے قریش کو خطاب
کرکے فرمایا انتم اولی الناس بھذا الامر ما کنتم علی الحق الا ان تعدلوا عنہ فتلحون
کما تلحی ھذہ الجریدہ "تم اس کارِ حکومت کے سب لوگوں سے زیادہ مستحق ہو جب تک کہ
حق پر قائم رہو۔ لیکن اگر حق سے منہ موڑو گے تو تمہاری کھال اس طرح کھینچی جائے گی جیسے اس
ٹہنی کی چھال اتار دی جائے"۔

بیہقیؒ، طبرانیؒ اور شافعیؒ نے مختلف سندوں سے حضورؐ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ قدموا
قریشاً ولا تقدموھا "قریش کو آگے کرو اور ان سے آگے نہ بڑھو"۔

مُسند احمد میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ قریش قادۃ الناس "قریش
لوگوں کے قائد و رہنما ہیں"۔

یہ تمام روایات صاف بتا رہی ہیں کہ حضورؐ نے محض اپنے فوراً بعد رونما ہونے والے کسی
قضیۂ خلافت کا فیصلہ نہیں فرمایا تھا بلکہ مستقل طور پر یہ طے فرما دیا تھا کہ جب تک قریش میں چند
خاص صفات موجود رہیں اس وقت تک دوسروں کی بہ نسبت رجحان ہے ان دوسروں میں بھی یہ
صفات موجود ہوں، خلافت پر ان کا حق مرجح ہوگا۔ اس میں صرف انصار پر ترجیح کا مسئلہ نہ تھا بلکہ تمام
عرب و عجم کے مسلمانوں پر اس قبیلے کی مشروط ترجیح کا فیصلہ تھا۔ یہی مطلب ان ارشادات کا تمام علمائے

امت نے بالاتفاق سمجھا ہے اور تاریخ میں بجز خوارج اور معتزلہ کے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہوا ہے۔

عبدالقاہر بغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) اپنی مشہور کتاب الفَرق بین الفِرَق کی تیسری فصل میں وہ پندرہ اصول بیان کرتے ہیں جن پر گمراہ فرقوں کے مقابلے میں اہل السنت کا اتفاق ہے۔ ان میں سے بارھواں اصول ان کے بیان کے مطابق یہ ہے:

"امامت کا قیام امت پر فرض و واجب ہے . . . اس امت میں امامت منعقد ہونے کا طریقہ اجتہاد سے کسی شخص کا انتخاب ہے . . . اور وہ سب اس بات کے قائل ہیں کہ امامت کے لیے قرشی النسب ہونا شرط ہے" (صفحہ ۳۴۰-۳۴۱)

ابنِ حزم (متوفی ۴۵۶ھ) الفِصَل فی المِلَل والنِحَل میں لکھتے ہیں:

"اہل السنت اور تمام شیعہ اور بعض معتزلہ اور جمہور مرجئہ کا مذہب یہ ہے کہ امامت جائز نہیں ہے مگر خصوصیت کے ساتھ قریش میں . . . اور تمام خوارج اور جمہور معتزلہ اور بعض مرجئہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ منصب ہر اس شخص کے لیے جائز ہے جو کتاب و سنت پر قائم ہو خواہ قرشی ہو یا عام عرب یا کوئی غلام زادہ۔ اور ضرار بن عمرو غطفانی کہتا ہے کہ اگر حبشی اور قرشی دو شخص کتاب و سنت پر قائم ہوں تو واجب یہ ہے کہ حبشی کو آگے کیا جائے کیونکہ بدراہ ہو جانے کی صورت میں اسے ہٹانا آسان ہے۔ (اس کے بعد ابن حزم خود اپنی تحقیق بیان کرتے ہیں کہ) فِہر بن مالک کی اولاد کے لیے امامت کو خاص کرنے کا وجوب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نص کی بنا پر مانتے ہیں کہ آپ نے امامت قریش ہی میں رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی اور یہ روایت تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہے . . . اور اس روایت کی صحت پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انصار نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا حالانکہ شہر اُن کا تھا، وہ سر و سامان اور تعداد رکھتے تھے اور اسلامی خدمات میں کسی سے کم نہ تھے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نص سے یہ حجت قائم نہ ہو جاتی کہ اس معاملہ میں دوسروں کا حق ان پر فائق ہے تو

وہ اپنے اجتہاد کے مقابلے میں دوسرے کسی کا اجتہاد ماننے پر مجبور نہ تھے" (جلد ۴ ص ۸۹)

عبدالکریم شہرستانی (متوفی ۵۴۸ھ) اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھتے ہیں کہ ان الامۃ اجتمعت علی انہا لا تصلح لغیر قریش "تمام امت اس بات پر متفق ہے کہ امامت قریش کے سوا کسی کے لیے درست نہیں ہے" (ج ۱ ص ۱۰۶)

امام نسفی (متوفی ۵۳۷ھ) عقائد نسفی میں لکھتے ہیں وینبغی ان یکون الامام من قریش ولا یجوز من غیرھم "ضروری ہے کہ امام قریش میں سے ہو اور ان کے سوا کسی دوسرے کو امام بنانا جائز نہیں ہے" اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ تفتازانی شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں کہ "اس پر اجماع ہے اور بجز خوارج اور بعض معتزلہ کے کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے"

قاضی عیاض (متوفی ۵۴۴ھ) لکھتے ہیں کہ "امامت کے لیے قرشیت کا شرط ہونا تمام علماء کا مذہب ہے اور علماء نے اس کو اجماعی مسائل میں شمار کیا ہے" (شرح مسلم للنووی، کتاب الامارہ)

امام نووی (متوفی ۶۷۶ھ) شرح مسلم میں لکھتے ہیں "یہ احادیث اور اسی معنی کی دوسری احادیث اس بات پر کھلی دلیل ہیں کہ خلافت قریش کے لیے خاص ہے اور ان کے سوا کسی اور کے لیے اس کا انعقاد جائز نہیں ہے۔ اس پر صحابہ کے زمانے میں اجماع ہو چکا تھا اور اسی طرح ان کے بعد بھی یہ اجماع قائم رہا" (کتاب الامارہ باب الخلافۃ فی قریش)۔

یہ تمام اکابر اہلِ علم آٹھ صدیوں تک مسلسل اس مسئلے پر امت کا اجماع نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ نویں صدی کے قریب پہنچ کر ابن خلدون یہ خبر دیتا ہے کہ یہ اجماع ٹوٹنا شروع ہو گیا مگر اس بنا پر نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نص کے کوئی نئے معنی اس وقت منکشف ہونے لگے تھے بلکہ اس بنا پر کہ:

"جب قریش کا اثر و اقتدار کمزور پڑ گیا اور مسلسل عیش و عشرت میں رہتے رہتے ان کی عصبیت ختم ہو گئی اور سلطنت کے معاملات نے ان کو تمام روئے زمین پر منتشر کر دیا تو وہ بارِ خلافت اٹھانے سے عاجز ہو گئے اور عجمیوں کو ان پر اتنا غلبہ حاصل ہو گیا کہ تمام حل و عقد کے وہی مالک ہو گئے۔ اس وجہ سے بکثرت محققین پر ان کا معاملہ مشتبہ ہو گیا

اور وہ یہ رائے قائم کرنے لگے کہ اب خلافت کے لیے قرشیت کی شرط باقی نہیں رہی ہے"

(مقدمہ - صفحہ ۱۹۴)

یہی بنیاد تھی اس امر کی کہ آخر کار دسویں صدی میں علماء کے ایک بڑے گروہ نے سلاطینِ آلِ عثمان کی خلافت تسلیم کرلی۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ آیا علماء امت نے حضور کے ارشادات کو انصار و مہاجرین کے کسی قضیے کا وقتی فیصلہ سمجھا تھا یا بعض اوصاف کی شرط کے ساتھ ایک مستقل دستوری حکم۔ کیا یہ بات باور کیے جانے کے لائق ہے کہ پوری امت کے علماء بالاتفاق ایک نص کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر جائیں اور صدیوں اس غلطی میں پڑے رہیں ؟

اس کے بعد دوسرے سوال کو لیجیے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے کسی بڑی عقل و خرد کی ضرورت نہیں ہے کہ "اہلیت و قابلیت" کا اطلاق صرف انہی اوصاف پر ہوتا ہے جو ہر شخص کو حاصل ہونے ممکن ہوں، نہ کہ کسی ایسے وصف پر جو کسی شخص کو اس وقت تک نصیب نہ ہو سکے جب تک وہ کسی خاص قبیلے، خاندان، وطن یا رنگ و نسل میں پیدا نہ ہو۔ اصولِ مساوات کے ساتھ اگر مطابقت رکھتی ہے تو صرف پہلی قسم کے اوصاف کی شرط ہی رکھتی ہے، رہا دوسرا وصف، تو چاہے آپ کھینچ تان کر اس پر بھی "اہلیت و قابلیت" کی اصطلاح استعمال کر ڈالیں، لیکن اس نوع کی "اہلیت" کو کسی منصب کے قابل ہونے کے لیے شرط قرار دے دینا اصولِ مساوات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر اگر آپ کہیں کہ پاکستان کے باشندوں میں سے جو شخص بھی عمدہ قانونی قابلیت رکھتا ہو وہ جج بنائے جانے کا اہل ہے، تو یہ بات حقوق میں تمام پاکستانیوں کی مساوات کے اصول سے پوری طرح مطابق ہوگی۔ لیکن اگر آپ مثلاً یہ کہیں کہ صرف ایک قانون داں جاٹ ہی پاکستان میں جج بن سکتا ہے تو اسے کوئی صاحبِ عقل آدمی اصولِ مساوات سے مطابق نہیں مانے گا۔ اس پر آپ خواہ کتنی ہی منطق بگھاریں کہ عدالت کے لیے قانونی دھاک کی ضرورت ہے اور یہاں مدتوں سے جاٹوں ہی کی قانونی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اس لیے جاٹ ہونا بھی قابلیت ہی کا ایک حصہ ہے۔ مگر آپ کی کوئی سخن سازی بھی کسی سیدھی سادھی عقل کے آدمی کو اس بات پر مطمئن نہ کر سکے گی کہ اس خاص قسم

کی قابلیت" کو عدالتی مناصب کے لیے شرط ٹھیرانے پر بھی اس معاملے میں تمام پاکستانیوں کی مساوات کا اصول قائم رہتا ہے۔ وہ کہے گا کہ اگر آپ اپنے ہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں تو صاف کہیے کہ ہم بربنائے مصلحت ایسا کر رہے ہیں، آخر یہ خواہ مخواہ محض زبان کے زور سے آپ اصولِ مساوات کے گول سوراخ میں اس نئے تصورِ اہلیت کی چوکھونٹی میخ کیوں ٹھونک رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی شریعت اپنی کسی بات کی صحت و صداقت ثابت کرنے کے لیے اس طرح کی لاطائل سخن سازیوں کی محتاج نہیں ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ اسلام اپنے نظامِ زندگی میں بلا امتیازِ نسل و وطن و رنگ تمام مسلمانوں کو برابر کے حقوق دینے کا قائل ہے۔ اس میں ہر شخص ہر منصب کا اہل ہے جبکہ وہ اس کی صلاحیت رکھتا ہو، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، عربی ہو یا عجمی، سامی ہو یا حامی۔ خلافت کے سوا باقی تمام مناصب کے معاملے میں یہ اصول اول روز ہی سے اسلام میں عملاً قائم کر دیا گیا تھا۔ اور خود خلافت کے معاملے میں بھی اسلام کا مطمحِ نظر یہی تھا کہ اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی "سنو اور مانو خواہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے"۔ لیکن اس خاص منصب کے لیے اُس وقت جس وجہ سے قرشیت کی شرط لگائی گئی وہ یہ تھی کہ خلافتِ اسلامیہ کے لیے عربوں ہی کو ایک طویل مدت تک ریڑھ کی ہڈی کا کام دینا تھا، اور عربوں کے اندر سے قبائلی عصبیتیں اس حد تک عملاً نہیں نکل سکی تھیں کہ کوئی مسلمان بھی خلیفہ بنا دیا جاتا تو وہ اس کی قیادت میں پوری طرح مجتمع ہو کر کام کر سکتے، اس لیے ایک ایسے قبیلے کو خلافت کا علمبردار بنا دینا مناسب سمجھا گیا جس کی قیادت ایک مدتِ دراز سے عرب میں مسلّم چلی آ رہی تھی، جس کی سربراہی عربوں کو متحد رکھ سکتی تھی، اور جس کی طاقت انحراف کرنے والوں کو دبا سکتی تھی۔ یہ وہ مصلحت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے متعدد ارشادات میں واضح فرمائی ہے۔ مسند احمد میں سقیفۂ بنی ساعدہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر نے صحابہ کی بھری مجلس میں حضرت سعد بن عبادہ کو خطاب کر کے فرمایا:

لقد علمت یا سعد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال وانت قاعد، قریش ولاۃ ھذا الامر فبرّ الناس تبع لبرھم وفاجرھم تبع لفاجرھم فقال سعد صدقت۔ (مرویات ابی بکر صدیق، حدیث ۱۸)

اے سعد تم کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا، اور تم اس وقت بیٹھے تھے جب حضورؐ نے یہ فرمایا کہ قریش اس قیادت کے متولی ہیں، نیک لوگ ان کے نیک لوگوں کی پیروی کرتے ہیں اور بد ان کے بدوں کی۔ سعد نے کہا آپ سچ کہتے ہیں۔

پھر اسی تقریر میں حضرت ابوبکرؓ نے کہا:

ولم تعرف العرب ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش (مرویات عمر فاروق حدیث ۳۹۱)

اور عرب اس قبیلہ قریش کے سوا کسی اور کی قیادت کو نہیں جانتے۔

اسی مُسند میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ

سمعت اذنای ووعاہ قلبی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمؐ الناس تبعٌ لقریش صالحھم تبع لصالحھم وشرارھم تبعٌ لشرارھم (حدیث ۷۹)

میرے ان دونوں کانوں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہے کہ لوگ قریش کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ ان کے صالح قریش کے صالحوں کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے اشرار قریش کے اشرار کی

اسی مضمون کی روایات مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ اور جابر بن عبداللہ سے بھی منقول ہوئی ہیں۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بنا پر قریش کے لیے خلافت مخصوص کرنے کی ہدایت فرمائی وہ یہ تھی کہ عرب میں ان کا اثر و اقتدار پہلے سے قائم چلا آ رہا تھا، اصولِ مسادات قائم کرنے کے لیے اگر اس وقت خلافت کا منصب ہر عربی و عجمی مسلمان کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا اور کسی غیر قریشی عرب یا عجمی مسلمان یا غلام زادے کو خلیفہ منتخب کر لیا جاتا تو

نہ صرف یہ کہ عرب قبائل اس کے قابو میں نہ رہتے بلکہ خود قریش کے اندر جو بڑے لوگ تھے ان کو بھی سر اٹھانے کا موقع مل جاتا اور قریش کی طاقت کا بڑا حصہ خلافتِ اسلامیہ کی مزاحمت میں صرف ہوتا۔ اس طرح یہ خطرہ تھا کہ سرے سے وہ اسلامی نظام ہی مستحکم نہ ہو سکتا جس کے بے شمار اصولِ خیر میں سے صرف ایک یہ اصولِ مساوات تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اولیٰ اور انسب یہی سمجھا کہ ان حالات میں قریش کے صالحین کو کام کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ اس قبیلے کی طاقت اسلامی خلافت کی مزاحم بننے کے بجائے اس کی پشت پناہ بنے ——

اس صورت میں یہ غالب توقع تھی کہ اسلامی نظامِ زندگی غالب اور مستحکم ہو کر رہے گا، اور جب وہ پوری طرح نافذ و مستحکم ہو گا تو جہاں اور بے شمار بھلائیاں قائم ہونگی وہیں ایک روز خلافت کے معاملے میں بھی اصولِ مساوات قائم کرنے کے لیے سازگار حالات پیدا ہو جائیں گے۔

یہ ہے صحیح توجیہ حضورؐ کے اس فیصلے کی۔ اس سے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں

اولاً، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی جن لوگوں کو قائم کرنا اور چلانا ہو انہیں یہی آنکھیں بند کر کے حالات کا لحاظ کیے بغیر پورا کا پورا نسخۂ اسلام بیک بارگی استعمال نہ کر ڈالنا چاہیے بلکہ عقل اور بینائی سے کام لے کر زمان و مکان کے حالات کو ایک مومن کی فراست اور فقیہ کی بصیرت و تدبّر کے ساتھ ٹھیک جانچنا چاہیے۔ جن احکام اور اصولوں کے نفاذ کے لیے حالات سازگار ہوں انہیں نافذ کرنا چاہیے، اور جن کے لیے حالات سازگار نہ ہوں ان کو مؤخر رکھ کر پہلے وہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں جن سے ان کے نفاذ کے لیے فضا موافق ہو سکے۔ اسی چیز کا نام حکمت یا حکمتِ عملی ہے جس کی ایک نہیں بیسیوں مثالیں شارع علیہ السلام کے اقوال اور طرزِ عمل میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامتِ دین بُدھوؤں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

ثانیاً، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب زمان و مکان کے حالات کی وجہ سے اسلام کے دو احکام یا اصولوں یا مقاصد کے درمیان عملاً تضاد واقع ہو جائے، یعنی دونوں پر بیک وقت عمل کرنا ممکن نہ رہے تو دیکھنا چاہیے کہ شریعت کی نگاہ میں اہم تر چیز کون سی ہے، اور پھر جو

چیز اہم تر ہو اس کی خاطر شرعی نقطۂ نظر سے کم تر اہمیت رکھنے والی چیز کو اس وقت تک ترک کر دینا چاہیے جب تک دونوں پر ایک ساتھ عمل کرنا ممکن نہ ہو جائے، لیکن اسی حد تک ایسا کرنا چاہیے جس حد تک یہ ناگزیر ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافتِ اسلامیہ کے استحکام کو اصولِ مساوات کے قیام پر ترجیح دی، کیونکہ خلافت کے استحکام پر پورے اسلامی نظامِ زندگی کا قیام و نفاذ موقوف تھا اور یہ کُل اسلام کی نگاہ میں ایک جُز کی بہ نسبت عظیم تر اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن آپ نے اس مقصد کے لیے اصولِ مساوات کو بالکلیہ نہیں بلکہ اس کے صرف اُس حصّے کو معطّل رکھا جو منصبِ خلافت سے متعلق تھا، کیونکہ صرف اسی حد تک اُس کا تعطّل ناگزیر تھا۔ یہ ایک مثال ہے قاعدۂ اختیار اہون البلیتین کی۔ اس سے وہ موقع و محل بھی معلوم ہو جاتا ہے جس میں یہ قاعدہ جاری ہو گا اور اس کے حدود و شرائط پر بھی روشنی پڑتی ہے

ثالثاً، اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جہاں قبائلیت اور برادریوں کے تعصبات یا دوسری گروہی عصبیتیں زندہ و متحرک ہوں، وہاں ان سے براہِ راست تصادم کرنا مناسب نہیں ہے بلکہ جہاں جس قبیلے یا برادری یا گروہ کا زور ہو وہاں اسی کے نیک لوگوں کو آگے لانا چاہیے تاکہ زور آور گروہ کی طاقت اسلامی نظام کے نفاذ کی مزاحم بننے کے بجائے اس کی مددگار بنائی جا سکے اور بالآخر نیک لوگوں کی کارفرمائی سے وہ حالات پیدا ہو سکیں جن میں ہر مسلمان مجردِ اپنی دینی و اخلاقی اور ذہنی صلاحیت کی بنا پر، بلا لحاظ نسل و نسب و وطن سربراہی کے مقام پر آ سکے۔ یہ بھی اُسی حکمت کا ایک شعبہ ہے جسے حکمتِ عملی کے نام سے یاد کرنے کا گناہ مجھ سے سرزد ہُوا ہے۔

یہ اصول جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول و عمل سے مَیں نے مستنبط کیے ہیں اگر ان میں کوئی قباحت کسی کو نظر آتی ہو تو وہ دلیل کے ساتھ اس کی نشان دہی کرے۔ رہا اس پر کسی کا یہ اعتراض کہ اس نوع کے تصرفات کرنے کا حق صرف شارع کو پہنچتا تھا، دوسرا کوئی اس کا مجاز نہیں ہو سکتا، تو میں صاف عرض کروں گا کہ یہ بات اگر مان لی جائے تو فقہ اسلامی کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔

کیونکہ اُس کا تو سارا نشو و ارتقا ہی اس بنیاد پر ہوا ہے کہ شارعؑ کے زمانے میں جو حوادث اور معاملات پیش آئے تھے ان میں شارع کے احکام اور تصرفات اور طرز عمل کا گہرا مطالعہ کر کے وہ اصول اخذ کیے جائیں جو شارع کے بعد پیش آنے والے حوادث و معاملات پر منطبق ہو سکتے ہوں۔ اس کا دروازہ بند ہو جائے تو پھر فقہ اسلامی صرف انہی حوادث و معاملات کے لیے رہ جائیگی جو شارع کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ بعد کے نئے حالات میں ہم بالکل بے بس ہونگے۔

یہ آپ کے چوتھے سوال کا جواب ہے۔ اب میں آپ کے اس سوال کی ایک ایک شق پر الگ الگ کچھ عرض کروں گا:

الف۔ حکمتِ عملی کی تشریح میں اوپر کر چکا ہوں۔ مختصراً اس سے مراد یہ ہے کہ دین کی اقامت اور احکامِ شرعیہ کی تنفیذ میں اُن حالات پر نگاہ رکھی جائے جن کے اندر ہم کام کر رہے ہوں، اور حالات کے تغیّر و تبدّل سے فتوے اور طرزِ عمل میں ایسا تغیّر و تبدل کیا جائے جس سے مقاصدِ شرعیہ ٹھیک ٹھیک حاصل ہو سکیں نہ کہ نامناسب حالات پر احکام اور اصولوں کے انطباق سے وہ اُلٹے فوت کر ڈالے جائیں۔ لیکن یہ حکمت بے قید نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے تفقّہ فی الدین اور مزاجِ شریعت پر گہری نظر درکار ہے تاکہ آدمی شارع کے منشا سے قریب ترین ممکن تدبیر اختیار کر سکے۔ اور اس حکمت کے قابلِ تسلیم یا قابلِ رد ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی کسی خاص معاملے میں جب اس کو استعمال کر رہا ہو تو وہ کتاب و سنت سے اپنے فتوے یا فیصلے یا طرزِ عمل کا ماخذ پیش کرے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ شارع کے کس تصرف پر قیاس، یا کس ارشاد سے استنباط کر رہا ہے۔

قاعدۂ اختیارِ اہون البلیتین یہ ہے کہ جب کبھی آدمی کو ایسے حالات سے سابقہ پیش آئے جن کے اندر دو برائیوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے تو وہ اس برائی کو اختیار کرے جو شریعت کی نگاہ میں کم بری ہو۔ اسی طرح جب شریعت کی دو قدروں یا دو مقاصد کو بیک وقت حاصل کرنا ممکن نہ ہو، یا دو احکام پر ایک ساتھ عمل نہ ہو سکے تو ان میں سے اس چیز کو اختیار کیا جائے جس کی قدر و اہمیت شریعت کی نگاہ میں زیادہ ہو اور کمتر قدر و اہمیت کی چیز کو زیادہ بیش قیمت چیز

پر اس حد تک قربان کیا جائے جس حد تک کہ وہ اس موقع و محل میں واقعی ناگزیر ہو۔ اس قاعدے کے استعمال کی صحت کا انحصار بھی اس پر ہے کہ آدمی جس چیز کو جس چیز پر ترجیح دے رہا ہے، اس کے اہم تر ہونے کی دلیل اس کے پاس کتاب و سنت سے ہو، اور وہ یہ ثابت کر سکے کہ اس وقت یہ ترجیح فی الواقع ناگزیر ہے۔

ب۔ اس قاعدے کے متعلق جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ صرف دو برائیوں ہی کے معاملے میں جاری ہوگا اور دو بھلائیوں یا دو احکام کے معاملے میں جاری نہ ہوگا، وہ ایک غلط بات کہتا ہے۔ اوپر میں خود اسوۂ نبوی سے اس کی ایک مثال دے چکا ہوں۔ ایک دوسری مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے عہد کی وہ ہے جو جنگ احزاب کے متصلاً بعد پیش آئی تھی۔ بخاری، مسلم، طبرانی، بیہقی، ابن سعد اور ابن اسحاق وغیرہ نے متعدد سندوں سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جنگِ احزاب سے فارغ ہوتے ہی حضورؐ نے صحابہ کی ایک جماعت کو بنی قُریظہ کی بستی پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا اور تاکید فرمائی کہ تم میں سے کوئی عصر کی نماز (اور بعض روایات کے مطابق ظہر کی نماز) نہ پڑھے جب تک وہاں نہ پہنچ جائے مگر ان لوگوں کو راستے میں دیر لگ گئی اور نماز کا وقت ختم ہونے لگا۔ اجتماعی طور پر وہ فیصلہ نہ کر سکے کہ آیا وقت پر نماز پڑھنے کے حکمِ عام کو چھوڑیں یا حضورؐ کے اس حکمِ خاص کو۔ آخر کار بعض لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ نماز پڑھ لیں گے اور پھر آگے جائیں گے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ حضورؐ تو دراصل یہ چاہتے تھے کہ ہم جلدی جلدی کوچ کر کے وہاں پہنچ جائیں، نہ یہ کہ ہم نماز ہی نہ پڑھیں۔ اور بعض نے فیصلہ کیا کہ ہم وہاں پہنچنے سے پہلے نماز نہ پڑھیں گے کیونکہ حضورؐ نے صاف الفاظ میں یہی حکم دیا ہے۔ بعد میں جب حضورؐ کے سامنے یہ معاملہ رکھا گیا تو آپ نے ان میں سے کسی کے فعل کو بھی غلط نہ کہا۔ اب دیکھ لیجیے، یہاں دو واجب الاطاعت احکام میں جب عملاً تضاد واقع ہو گیا تو ان میں سے کسی ایک کو ترک اور دوسرے کو اختیار کرنے کا فیصلہ ہر سپاہی نے اپنی صوابدید کے مطابق بطور خود کیا اور یہ کام خود صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا گیا۔ اگر اس طرح کے فیصلے کا ان لوگوں کو حق نہ ہوتا تو حضورؐ صاف فرما دیتے کہ تم نے دین میں وہ اختیار استعمال کیا ہے جو

شرعاً نہیں حاصل نہ تھا۔[1]

اسی طرح وہ شخص بھی بالکل ایک غلط بات کہتا ہے جو کہتا ہے کہ اس قاعدے کا استعمال شخصی حاجات و مشکلات رفع کرنے کی حد تک تو درست ہے مگر دین کے لیے اور اقامتِ دین کے کام میں اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سراسر ایک بے بنیاد دعوی ہے جس کے لیے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے خلاف دلائل کثرت سے موجود ہیں۔ خلافت و امامت سے بڑھ کر اقامتِ دین کا کام اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اور آپ ابھی دیکھ چکے ہیں کہ اس کے قیام و استحکام کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اہون البلیّتین کے قاعدے کو استعمال فرمایا۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر اقامتِ دین کا کام آپ کس کو کہہ سکتے ہیں؟ اور اس کی جنگی ضروریات کے لیے جہاں ناگزیر ہو وہاں جھوٹ کی اجازت حضورؐ نے خود دی ہے جیسا کہ مسلم اور ترمذی کی مستند احادیث سے ثابت ہے۔ اس چیز سے جس شخص کو انکار ہے اس سے میں پوچھتا ہوں کہ آج اگر آپ ایک حکومت خلافت علی منہاج النبوت کی بنیاد پر قائم کریں تو فرمائیے آپ کی حکومت دشمن ملکوں میں اپنے جاسوس بھیجے گی یا نہیں؟ اور اگر بھیجے گی تو انہیں بہت سے احکامِ شرعیہ کے معاملے میں ڈھیل دیگی یا نہیں؟ کیا وہ انہیں اس امر کا پابند بنائے گی کہ دشمن کے ملک میں پورے ناپ کی ڈاڑھی رکھیں، تشبہ بالکفار سے بچیں، کھانے پینے کے معاملہ میں تمام شرعی قیود کا لحاظ رکھیں اور اپنا کام بس سیدھے سیدھے حلال و طیب ذرائع ہی سے انجام دیں؟ فرض کیجیے کسی قوم سے آپ کو لڑائی پیش آتی ہے اور آپ ایسے مواقع پاتے ہیں کہ دشمنوں میں روپیہ پھیلا کر پھوٹ ڈلوا

---

[1] اس مسئلے سے آج بھی ان مسلمانوں کو سابقہ پیش آئے گا جو قطبِ شمالی کے دائرے میں مقیم ہوں۔ وہاں انہیں دو واجب الاطاعت احکام، یعنی نماز پنجگانہ کی فرضیت اور اوقاتِ نماز کی شرعی تعیین میں سے ایک کو لامحالہ چھوڑنا اور دوسرے کو اختیار کرنا ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ اس ترک و اختیار کا فیصلہ یا تو وہ خود کرینگے یا کسی مفتی سے فتوی لینگے۔ اور دونوں حالتوں میں فیصلہ بہرحال اسی بنیاد پر کیا جائے گا کہ ان دو حکموں میں سے اہم تر کونسا ہے اور کس کے چھوڑنے میں زیادہ قباحت ہے۔

سکیں، ان کے کام کے آدمیوں کو توڑ سکیں، ان کے جنگی راز معلوم کرسکیں، اور ان میں اپنا ایک پانچواں کالم پیدا کرسکیں۔ آپ ان مواقع سے فائدہ اٹھائیں گے یا ان سے تنزّہ برتیں گے؟ فرض کیجیے آپ خود اللہ کی راہ میں لڑنے جاتے ہیں اور دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دشمن آپ سے اسلامی حکومت کے جنگی راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ نہ خاموش رہنا ممکن ہے نہ توریہ سے کام چلتا ہے۔ اس حالت میں آپ اپنی فوج اور حکومت کے راز بتادیں گے یا دشمن کو قصداً جھوٹی اطلاعات دیکر خلافتِ اسلامیہ کو نقصان اور تباہی سے بچانے کی کوشش کریں گے؟ اس کا جواب نفی یا اثبات جس میں بھی ہو صاف صاف ہونا چاہیے تاکہ آپ کا صحیح موقف معلوم ہو سکے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت فرمادیں کہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا کام اور قتال فی سبیل اللہ بھی آپ کے ہاں "اقامتِ دین" میں شمار ہوتا ہے یا نہیں؟

(ج) اِس ضمن میں آپ نے جن اعتراضات و الزامات کا خلاصہ درج کیا ہے ان کی بنیاد تین صریح غلط بیانیوں پر ہے جنھیں نہ معلوم کس اضطرار کی حالت میں حلال کرلیا گیا ہے:

اوّل یہ کہ میں اب اقامتِ دین کی جدوجہد میں طریق عزیمت کو چھوڑ کر صرف رخصتوں اور حیلوں اور مصلحت پرستیوں ہی کے بل پر چلنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ دراصل میرے نزدیک اصل شاہ راہ بھی طریقِ عزیمت ہے اور اسی پر چلنے اور اپنی جماعت کو چلانے کی میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے، البتہ میں نے کبھی اپنی جماعت کو حالات کی تبدیلی کے ساتھ مباح و جائز تدابیر میں سے بعض کے ترک اور بعض کے اختیار کرنے کا مشورہ بھی دیا ہے، اور کبھی بالکل مستثنیٰ مواقع پر دو ناگزیر برائیوں میں سے بڑی برائی کو دفع کرنے کے لیے ایک کم تر درجے کی بُرائی صرف بقدرِ ضرورت اختیار کرنے کی بھی راے دی ہے۔ اسی چیز کو (خدا ہی جانے کن پاکیزہ جذبات کے ساتھ) الزام تراشیوں کا بہانہ بنالیا گیا ہے اور شور مچایا جارہا ہے کہ یہ شخص تو اب بس رخصتوں اور حیلوں اور مصلحت پرستیوں ہی پر اُتر آیا ہے۔

دوم یہ کہ میں اپنی کوئی سیاسی اغراض رکھتا ہوں اور انہی کی خاطر میں نے ایسا کیا ہے،

حالانکہ میں نے آج تک جو کچھ کیا ہے وہ صرف دین کو زندگی کا نظام غالب بنانے کی خاطر کیا ہے، میری کوئی سیاسی یا ذاتی غرض اس میں کارفرما نہیں رہی ہے۔

سوم یہ کہ میں دین کے جس اصول میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرتا ہوں اسے حدودِ شرعیہ کا لحاظ کیے بغیر دینی حکمت و مصلحت کے نام سے کر ڈالنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں اس شخص کو خدا کی لعنت کا مستحق سمجھتا ہوں جو ایسا کرے یا اس کا قائل ہو۔ میرا مسلک اس باب میں جو کچھ ہے اسے میں اس مضمون میں جگہ جگہ واضح کر چکا ہوں۔ میں نہ دین کے کسی اصول میں "ترمیم" کا قائل ہوں، نہ حدودِ شرعیہ سے یک سرِ مُو باہر جانے کو جائز رکھتا ہوں، اور نہ دینی حکمت و مصلحت کے نام سے کوئی کام کرنا صحیح سمجھتا ہوں جب تک کہ میں دلائلِ شرعیہ سے واقعی اس کو دینی حکمت و مصلحت نہ ثابت کر سکوں اور اس کام کے جائز ہونے کی شرعی دلیل نہ دے سکوں۔

(د) اس شق میں جو الزام آپ نے نقل کیا ہے وہ بھی ایک قطعی جھوٹا الزام ہے جس کے ثبوت میں میری کسی تحریر یا تقریر کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے دراصل جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ جس کو بھی اقامتِ دین کے لیے عملاً کام کرنا ہو، خواہ وہ کوئی ایک شخص ہو یا کوئی جماعت یا کوئی ریاست، اسے لازماً حالات پر نگاہ رکھ کر حکمت کے ساتھ ہی کام کرنا ہو گا، اور اس راہ میں کام کرتے ہوئے ضرورت پیش آنے پر اس کو صرف جائز تدابیر ہی میں ردّ و بدل نہیں کرنا ہو گا بلکہ بعض اوقات اس نوعیت کی رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھانا پڑے گا جو شریعت نے دی ہیں جن سے استفادہ کرنے میں انبیاء اور صحابۂ کرام نے بھی تنزّہ نہیں برتا ہے۔ اس چیز کو یہ معنی پہنائے گئے ہیں کہ میں خود اپنے لیے دین کے احکام و قوانین میں سے کسی کو ترک اور کسی کو اختیار کرنے اور کسی کو جائز اور کسی کو ناجائز ٹھیرانے اور کسی کو مقدم اور کسی کو مؤخر کرنے کے اختیارات کا مدّعی ہوں۔

یہ ایک عجیب نفسیاتی کیفیت ہے کہ آپ منطق کے زور لگا لگا کر ایک شخص کی بات میں سے بدترین معنی نکالنے کی کوشش کریں، اور وہ چاہے کتنی ہی وضاحت کے ساتھ اپنا صحیح مدعا

بیان کر دے مگر آپ یہی اصرار کیے چلے جائیں کہ نہیں تیرا اصل مدعا وہ نہیں ہے جو تو بیان کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو ہم تیری طرف منسوب کر رہے ہیں۔ گویا آپ کوئی وکیل استغاثہ ہیں جس نے ملزم کو کسی نہ کسی طرح پھانسنے ہی کے لیے اپنے موکل سے فیس لی ہے۔ ستم یہ ہے کہ یہاں موکل کوئی اور نہیں آپ کا اپنا نفس ہے، اس کی فیس لذتِ نفس کے سوا کچھ نہیں، اور آپ کی ساری دلچسپی کا محور بس یہ ہے کہ جس سے آپ ناراض ہیں اسے جس طرح بھی ہو جہنم کا مستحق ثابت کر دیں۔ ناخدا ترس حکام جب کسی پر بگڑتے ہیں تو اسے قانون اور نظم و ضبط کا دشمن قرار دے کر پکڑتے ہیں۔ خود غرض سیاسی لیڈر جس کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں اسے ملک اور قوم کا دشمن قرار دے کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایک خاص مزاج کے علماء جب کسی پر غضبناک ہوتے ہیں تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ خدا اور رسول کو بھی فریقِ مقدمہ بنائیں اور یہ ثابت کریں کہ جس شخص سے ہم ناراض ہیں وہ کم بخت تو دین کا دشمن ہے، بڑی گمراہی کا فتنہ اٹھا رہا ہے اور ایک جھوٹا دعویٰ لے کر اٹھا ہے، اس لیے ہم یہ سارے پاپڑ صرف خدا کے دین کو بچانے کے لیے بیل رہے ہیں۔ کاش ان حضرات کا غیظ اور طیش انہیں یہ سوچنے کی مہلت دے کہ یہ باتیں کہہ کے وہ اپنی اور اہلِ دین کی عزت میں کیا اضافہ فرما رہے ہیں۔

(ھ) اپنے سوال کی اس شق میں جو اعتراض آپ نے نقل کیا ہے وہ بھی دوسرے کی بات کو زیادہ سے زیادہ مبالغہ کر کے بُرے معنی پہنانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میں جس اصول کا قائل ہوں وہ سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ "تم دین کی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر جس بات کو چاہو اختیار اور جسے چاہو ترک کر سکتے ہو" اس لیے یہ ڈھیلا ڈھالا اصول جن لوگوں نے گھڑا ہو وہی اس کے بُرے نتائج کی تشریح فرماتے رہیں۔ مجھ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

(و) اس شق کا جواب یہ ہے کہ بجز ان امور کے جو خصوصیاتِ نبوی میں شمار کیے گئے ہیں، باقی تمام معاملات میں شارع کا قول، فعل، تقریر، غرض شارع کے جملہ تصرفات ایک ماخذِ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نظائر پر قیاس کر کے نئے حوادث کے لیے حکم نکالنا اور ان سے

اصول مستنبط کر کے پیش آمدہ مسائل پر انہیں منطبق کرنا ہی فقہ اسلامی کا مدارِ کار ہے۔ اس قیاس و استنباط کے اختیارات مختلف لوگوں کو ان کے دائرۂ کار کے لحاظ سے حاصل ہوتے ہیں۔ مفتی اور قاضی، صدرِ ریاست اور مجلس وزراء، مجلس شوریٰ اور اس کی کمیٹیاں، محکمۂ جنگ اور محکمۂ مال، محکمۂ خارجیہ اور محکمۂ داخلیہ، غرض اسلامی نظام کا ہر شعبہ اپنے اپنے کام اور منصب سے متعلق امور میں انہیں استعمال کرے گا۔ فوج کے ایک کمانڈر کو میدانِ جنگ میں اور پولیس کے ایک سپاہی کو بازاروں اور محلّوں میں جس وقت اچانک کسی معاملہ سے سابقہ پیش آئے گا اسی وقت اور اسی جگہ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ میں شرعاً اس موقع پر کیا کچھ کرنے کا مجاز ہوں۔ یہی نہیں ایک عام شہری بھی اگر مخمصے میں مبتلا ہو تو اس وقت کوئی مفتی نہیں بلکہ وہ شخص خود ہی یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا کہ آیا یہ حالت وہ ہے یا نہیں جس میں اس کے لیے حرام چیز کھا لینا جائز ہو۔ اگر اس کی جان مال یا آبرو پر حملہ ہو رہا ہو تو اسی کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا حفاظتِ خود اختیاری میں اس کے لیے اس وقت کسی ایسی جان کو ہلاک کرنا جائز ہے یا نہیں جسے خدا نے حرام کیا ہے۔ اگر زچگی کے موقع پر ماں اور بچے کی جان ایک ساتھ بچا لینا ممکن نظر نہ آئے تو اس وقت ایک دایہ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا یہ وقت وہ ہے یا نہیں جس میں وہ ایک نفس کی ہلاکت کی ذمّہ داری اپنے اوپر لے۔ غرض ایک نوعیت کے معاملات جس شخص سے متعلق ہوں ان میں فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے۔ اور اس طرح کے فیصلوں کی صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ آدمی واقعی قانونِ الٰہی کے اتباع کی نیت رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ کتاب و سنت میں اس کے فیصلے کے لیے کوئی ماخذ پایا جاتا ہو۔

یہ اصول بہت کسا ہوا ہے اگر اخلاص اور قواعدِ شرعیہ کی پابندی کے ساتھ اسے استعمال کیا جائے۔ اور یہ بہت ڈھیلا ڈھالا ہے اگر جہالت اور بدنیتی کے ساتھ کوئی اسے استعمال کرنے پر اتر آئے۔ بلکہ شریعت کا پورا نسخہ ہی ایسا ہے کہ اگر حدودِ شریعت سے آزادی کی خواہش رکھنے والوں کے ہاتھ میں وہ تھما دیا جائے تو وہ دین اور اخلاق کا تیا پانچا کر کے رکھ دیں۔ وہ بے وضو نماز پڑھا سکتے ہیں، کیونکہ شریعت نے کسی کو اس کا پابند نہیں کیا ہے کہ مقتدیوں کے

مطبوعات

تعارفِ قرآن و حدیث و فقہ | تالیف شیخ محمد اقبال ایم اے (عربی، اسلامیات و فلسفہ) لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور۔ طابع و ناشر: علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور۔ قیمت ڈھائی روپے صفحات ۲۴۵

ہمارے ہاں تفسیر، حدیث اور فقہ کی صورت میں جو بیش قیمت علمی سرمایہ موجود ہے، دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر اسے ہماری شومئی قسمت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہماری موجودہ نسل جس کی اکثریت مغربی تہذیب و تمدن کی دلدادہ ہے، اس سے دن بدن بے تعلق ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مغربی ثقافت کی چکا چوند روشنی نے اُس کی نظروں کو اس حد تک خیرہ کر دیا ہے کہ وہ اسلاف کے علمی کارناموں کی صحیح قدر و قیمت جاننے سے قاصر ہے۔ وہ اِن امور سے قطعاً نا آشنا ہے کہ مسلمانوں کے اندر تفسیر کا فن کس طرح شروع ہوا اور اس نے کس نہج پر ترقی کی احادیثِ نبوی کو قلمبند کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئیں، حدیث کی چھان پھٹک کے لیے کس قسم کا اہتمام کیا گیا۔ ہماری فقہ کی اساس کیا ہے اور قرآن و سنت سے کس طرح احکام مستنبط کیے

سامنے وضو کر کے امامت کرائے۔ وہ ہر روز چار عورتوں سے نکاح کر کے انہیں طلاق دے سکتے ہیں کیونکہ شریعت نے ایک مرد کو چار تک نکاح کرنے اور جب چاہے طلاق دے دینے کی آزادی دی ہے۔ وہ اضطرار کے بہانے سے جب چاہیں حرام چیز کھا اور پی سکتے ہیں، کیونکہ مضطر کو تو شریعت نے یہ اجازت دی ہی ہے۔ اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے اگر کوئی شخص اُن دروازوں کو بند کرنا چاہے جو شریعت نے خود ہی بندوں کی مصلحت اور بھلائی کے لیے رکھے ہیں تو اسے پوری شریعت کو بند کرنا پڑے گا، کیونکہ یہ شریعت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اس کی پابندی کرنا چاہیں۔ خروج کی نیت رکھنے والوں کے لیے تو اس میں رخنے ہی رخنے ہیں۔

جانتے ہیں اور ان احکام کی امتِ مسلمہ کے ہاں کیا اہمیت ہے۔ پھر ہمارے دینی ادب میں جو بعض اصطلاحات مستعمل ہیں اُن سے بھی ہمارے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ مثلاً وہ اجتہاد، مجتہد، محدث، اجماع، قیاس، مصالح مرسلہ، عُرف، خبرِ واحد تک کے مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ ان حالات کے پیشِ نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں کا نہایت ہی سہل طریق سے اردو زبان میں تعارف پیش کیا جائے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں اس قسم کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

زیرِ نظر تالیف تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں اسماء القرآن، سورت، آیت، وحی، نزولِ قرآن، مکی اور مدنی آیات، جمع و تدوینِ قرآن، تفسیر، تاریخِ تفسیر اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ حدیث سے متعلق ہے۔ اس میں اصطلاحاتِ حدیث، اقسامِ حدیث اور تدوینِ حدیث کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسی طرح تیسرا حصہ اصطلاحات اور تاریخِ فقہ پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب اختصار اور جامعیت کا ایک نہایت اچھا مرقع ہے۔ فاضل مصنف کا اندازِ فکر بالکل صحیح ہے اور اس میں تجدد پسندی کا قطعاً کوئی رجحان نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اس میں جو کچھ پیش کیا ہے وہ عربی کے مستند مآخذ سے اخذ کیا ہے۔ کتاب کے یوں تو تینوں حصے ہی قابلِ قدر ہیں مگر دوسرا حصہ جو سنتِ رسول سے متعلق ہے وہ تبصرہ نگار کے نزدیک سب سے اچھا ہے۔ کاش اس کتاب کی کتابت اور طباعت کا بھی پورا اہتمام کیا جاتا۔

(بقیہ اشارات)

اور اس غرض کے لیے رمضان کے روزے فرض کر دیے۔ انسان غیر اللہ کے لیے تیرتھ یاترا کرتا اور استھانوں کے طواف کرتا تھا۔ دینِ حق نے اس کے لیے ایک بیت اللہ بنایا اور اس کا حج اور طواف فرض کر دیا۔ اسی طرح انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک غیر اللہ کے لیے قربانی کرتا رہا ہے۔ دینِ حق نے اسے بھی غیر اللہ کے لیے حرام کر دیا اور حکم دیا کہ یہ چیز بھی صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ چنانچہ دیکھیے، ایک طرف قرآن مجید مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ (جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو) اور مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (جسے استھانوں پر ذبح کیا گیا ہو) کو قطعی حرام قرار دیتا ہے اور دوسری طرف حکم دیتا ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ: اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر۔

(۲) انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں بھی عطا فرمائی ہیں ان سب کا شکریہ اس پر واجب ہے اور یہ شکریہ ہر نعمت کے لئے قربانی اور نذرانہ کی شکل میں ہونا چاہیے۔ ذہن اور نفس کے عطیے کا شکریہ اسی شکل میں ادا ہو سکتا ہے کہ آدمی ایمان و طاعت کی راہ اختیار کرے۔ جسم اور اس کی طاقتوں کا عطیہ یہی شکریہ چاہتا ہے کہ آدمی نماز اور روزے کی شکل میں اسے ادا کرے۔ مال کے عطیے کا شکریہ زکوٰۃ ہی کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے، اور زکوٰۃ بھی اس طرح کہ سیم و زر کی زکوٰۃ اسی سیم و زر سے، زرعی پیداوار کی زکوٰۃ اسی پیداوار میں سے اور مواشی کی زکوٰۃ انہی مواشی میں سے نکالی جائے۔ اسی طرح اپنے پیدا کیے ہوئے جانوروں پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو قدرت بخشی ہے اور ان سے طرح طرح کے بے شمار فائدے اٹھانے کا جو موقع اس نے دیا ہے، اس کے شکریے کی بھی یہی صورت ہے کہ انسان ان جانوروں ہی میں سے اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کرے۔ چنانچہ سورۂ حج میں قربانی کی ہدایت فرمانے کے بعد اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "اسی طرح ہم نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔"

(۳) انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں پر جو اقتدار اور تصرف کا اختیار بخشا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بالادستی اور اس کی حاکمیت و مالکیت کا اعتراف کرتا رہے تاکہ اسے کبھی یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ سب کچھ میرا ہے اور میں ہی اس کا خود مختار مالک ہوں۔ اس بالاتری کے اعتراف کی مختلف شکلیں اللہ کے مختلف عطیوں کے معاملے میں رکھی گئی ہیں۔ جانوروں کے معاملہ میں اس کی شکل یہ ہے کہ انہیں اللہ کے نام پر قربان کیا جائے۔ چنانچہ اسی سورۂ حج میں اسی سلسلۂ کلام میں آگے چل کر فرمایا گیا کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ "اسی طرح اللہ نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اس کی بڑائی کا اظہار کرو اس ہدایت پر جو اس نے تمہیں بخشی"۔

یہی تین وجوہ ہیں جن کی بنا پر قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیشہ سے تمام شرائع الٰہیہ میں تمام امتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے قربانی کا طریقہ مقرر کیا ہے:

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا لِّیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (الحج۔ رکوع ۵)

اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک طریقہ مقرر کیا تاکہ وہ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔

اور یہ طریقہ جس طرح دوسری امتوں کے لیے تھا اسی طرح شریعتِ محمدی میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی مقرر کیا گیا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (الانعام، رکوع ۲۰)

اے محمدؐ، کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور اسی چیز کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں سرِ اطاعت جھکانے والا ہوں۔

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ (الکوثر)

بس اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔

یہ حکم عام تھا جو قربانی کے لیے قرآن میں دیا گیا۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ قربانی کب کی جائے، کہاں کی جائے، کس پر یہ واجب ہے، اور اس حکم پر عمل درآمد کرنے کی دوسری تفصیلات کیا ہیں۔ ان چیزوں کو بیان کرنے اور ان پر عمل کر کے بتانے کا کام اللہ نے اپنے رسول پر چھوڑ دیا کیونکہ رسول اس نے بلا ضرورت نہیں بھیجا تھا۔ کتاب کے ساتھ رسول بھیجنے کی غرض یہی تھی کہ وہ لوگوں کو کتاب کے مقصد و منشا کے مطابق کام کرنا سکھائے۔

خــــالی صفحـــــه

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں جن کے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے۔

* — پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں مرد اور عورت کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے

* — دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے۔

اول الذکر مسئلے کے بارے میں انسانی ذہن نے آج تک کیا حل تجویز کئے ہیں ؟

* — قدیم یونان، روم اور مسیحی یورپ کے تمدنی نظریات نے اس کا کیا جواب دیا ؟ اور اس کے کیا عملی نتائج برآمد ہوئے ؟

* — جدید مسیحی یورپ اور مغربی اقوام اس بارے میں کیا کیا ٹھوکریں کھا رہی ہیں۔ اور کس قدر خوفناک عواقب سے دوچار ہیں ؟

اس کے برعکس۔

* — اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے۔ اور انسانی نظام اجتماع کے لئے کیا اصول و نظریات قائم کئے ہیں ؟

* — عورت کے لئے پردے کو کیوں لازم قرار دیا ؟

* — اسلامی پردے کی نوعیت اور حدود کیا ہیں ؟

آپ کو ان تمام سوالات کا جواب

سید ابوالاعلی مودودی

کی معرکۃ الآرا تصنیف **پردہ** میں تفصیل سے ملے گا۔

ضخامت : ۴۰۰ صفحات — قیمت مجلد چار روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور